

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

[illegible]

مرتب

تاج سعید

مکتبہ ارژنگ
ظہیر آباد۔ پشاور

ان دوستوں کے نام

جنہوں نے اپنے نوکِ قلم سے اپنے ساتھیوں کے
چہروں کو الفاظ کا روپ دے کر، انہیں دوام
بخش دیا ہے۔

اور ان دوستوں کے نام

جن کے چہروں کے گلاب اس کتاب کے
صفحات پر بکھرے ہوتے ہیں۔

بار اوّل ——— ۱۹۷۷ء

ناشر ——— آذر سعید

مکتبہ ارژنگ ظہیر آباد، پشاور

طابع ——— شاہین پرنٹنگ پریس پشاور

سرورق ——— کشش

قیمت ——— ۱۲/- روپے

ترتیب

ابتدائیہ

ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ان کے قلم کار دوستوں کی تحریریں اکثر تو بیشتر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے ان کا جنم کسی نہ کسی تقریب پر ہوتا ہے اور ان کو سرسری طور پر پڑھنے کے بعد عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور یہ مضامین رسائل و جرائد کی فائلوں میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ یہی نہیں صاحبِ مضمون بھی اسے وقتی تحریر سمجھ کر اسے اپنے کسی مجموعے میں شامل کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں؛ حالانکہ ان میں سے اکثر محبت اور خلوص کا منہ بولتا شاہکار ہوتی ہیں۔

یہ مجموعہ بھی ایسے ہی چند مضامین پر مشتمل ہے، جو کسی نہ کسی تقریب کے سلسلے میں لکھے گئے، لیکن ان مضامین کی حیثیت وقتی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ اس لئے کہ نہ وہ لوگ عام لوگ ہیں جن پر یہ مضامین لکھے گئے ہیں اور نہ ہی لکھنے والے!

چند مضامین اس لئے اہم ہیں کہ ان کے لکھنے والے ہم میں موجود نہیں لیکن ان کی تحریریں ان کی زندگی کے ثبوت کے طور پر موجود ہیں۔ کچھ ایسے فنکار بھی ہیں۔ جن کا انتقال گزشتہ برسوں میں ہوا ہے ان کے بارے میں ان کے دوستوں نے یادوں کے پھول کھلائے ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں جو بقید حیات ہیں، ان کی شخصیت و فن کے بارے میں ان کے ہم قلم ساتھیوں کی تحریریں ان کی پہچان کرانے کا سبب بنتی ہیں میرے خیال میں اس لحاظ سے ان تحریروں کی حیثیت دوامی ہے اور آنے والے دور میں ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی، اس لئے کہ ان میں زندہ رہنے کی سکت ہے اور ادب کے قاری کے لئے ان میں بہت کچھ موجود ہے۔

تاج سعید



ایک ذہین شاعر

احمد ندیم قاسمی

مختار صدیقی عمر میں مجھ سے ڈھائی تین برس چھوٹے تھے۔ چنانچہ یہ آج سے پینتیس چھتیس برس پہلے کا ذکر ہے کہ میں فارغ التحصیل ہو کر لاہور میں بسلسلۂ تلاشِ معاش مقیم تھا تو مختار یہیں کے کسی کالج کے طالب علم تھے۔ وہ اندرون بھاٹی دروازہ مجھ سے میرے گھروندے میں ملنے آئے۔ کہنے لگے کہ میں نے آپ کی نظموں اور خاص طور سے قطعات میں نظیر اکبر آبادی کے لہجے کی لٹک اور کھنک محسوس کی ہے اس لئے ملنے آگیا ہوں۔ بیس اکیس برس کی عمر کا ایک نو آموز شاعر۔ اگر کسی شدید غلط فہمی یا خود فریبی میں مبتلا نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اتنی بہت سی داد کے بوجھ تلے چکرا جائے گا سو میں چکرا گیا اور گھبراہٹ میں یہ سچی بات کہہ دی کہ میں نے تو نظیر اکبر آبادی کو ابھی تک پڑھا ہی نہیں۔ مختار بولے "نہیں پڑھا تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اب آپ نظیر کو پڑھیں گے تو آپ کے فن کا حسن دوگونہ ہو جائیگا اور اگر آپ کی اور ہماری دوستی ہو گئی تو نظیر کو اکٹھا پڑھیں گے" بعد میں جب مختار بیڈن روڈ کی ایک عمارت میں جہاں اب فضل بلڈنگ ہے مقیم تھے تو ہم نے نظیر کو اور انیس کو اور ولی کو اکٹھا پڑھا۔ بلکہ پڑھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، مختار کو نظیر کی درجنوں نظمیں، انیس کے کئی مرثیے اور ولی کی ان گنت غزلیں ازبر تھیں اور وہ ایک ایک

مصرعے ایک ایک شعر پر رگ رگ کر اور دونوں ہاتھوں کو فضا میں بلند کر کے، داد بھی دیتے جاتے تھے اور سر بھی دھنتے جاتے تھے ان محفلوں میں کبھی کبھار میراجی بھی شریک ہو جاتے تھے۔ ایک بار جب مختار مرزا سودا کی غزلیں سنا رہے تھے میراجی اُٹھے اور کہا "مجھے گھر جانا ہے"! ہم دونوں انہیں نیچے سڑک پر چھوڑنے گئے واپس مختار کے کمرے میں آ کر پھر اساتذہ کے کمالِ فن اور حسنِ اظہار کا ذکر ہوتا رہا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد میں نے رخصت چاہی تو مختار میرے ہمراہ سیڑھیاں اُترے۔ نیچے آ کر ہم نے دیکھا کہ بیڈن روڈ کے اس حصے میں نئی عمارتوں کے لئے لکڑی کی جو گیلیاں کٹی ہوئی رکھی تھیں، ان میں سے ایک پر میراجی پڑے سو رہے تھے۔

میراجی سے میرا تعارف علیک سلیک اس حد تک رہا مگر مختار کے ساتھ دوستی کا رشتہ پینتیس چھتیس برس تک مسلسل برقرار رہا، حد یہ ہے کہ اُس وقت بھی برقرار رہا جب انجمن ترقی پسند مصنفین نے اُس زمانے کے حلقۂ اربابِ ذوق کو، منفیت انفعالیت اور مریضانہ جنسیت زدگی کا گڑھ قرار دے ڈالا تھا اور میں انجمن کا جنرل سیکرٹری تھا اور مختار حلقے کی روحِ رواں تھے۔ اُن دنوں نظریاتی اختلافات اپنی جگہ برقرار رہتے تھے مگر دوستیاں یوں آسانی سے نہیں ٹوٹتی تھیں، مختار کو بہت اچھی طرح علم تھا کہ ۱۹۴۸ء سے ۶۹ - ۱۹۶۸ء تک کے بیس بائیس برس کے دوران خفیہ پولیس سائے کی طرح ہم لوگوں کے ساتھ رہتی تھی مگر ان بیس بائیس برسوں میں مختار سے جب بھی ملاقات ہوتی، ہمیشہ کھلی باہوں سے ملاقات ہوتی تب نہ جانے وہ اہل قلم دوست یاد آتے تھے جو مجھے دُور سے آتا دیکھ کر آس پاس کی گلیوں میں مڑ جاتے تھے کہ مڈبھیڑ ہوئی تو سلاموں کا تبادلہ نہ کرنا پڑ جائے اور یہ سلام سرکاری رجسٹر میں درج نہ کر لئے جائیں۔ مختار ہاکی کے بہت عمدہ کھلاڑی

تھے۔ بدن کسرتی تھا ایسے گٹھے ہوئے توانا جسم کے شاعر میں نے بہت کم دیکھے ہیں ان کی رنگت سانولی تھی چنانچہ ان کے بعض احباب انہیں لوہے کی لاٹھ کہتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ دوستی کو بہرصورت نبھانے اور وضعداری کو بہرحال برقرار رکھنے کے معاملے میں وہ سچ مچ لوہے کی لاٹھ تھے ذہنی اور روحانی لحاظ سے اتنے تنومند شاعر میری نظر سے خال خال ہی گزرے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی کرب اور انفرادی المیے کے باوجود تنومند تھے تنومند نہ ہوتے تو وہ دوستوں سے اس قسم کی گفتگو لیوں کرتے کہ اگر تم نے پچھلے چھ مہینے سے کوئی شعر نہیں کہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے چھ مہینے سے تمہاری وفات حسرت آیات ہو چکی ہے ابھی چھ ماہ پہلے کی بات ہے، مجھ سے بھی یہی کہا تو میں نے بزعم خویش جوابی حملہ کیا اور کہا کہ کچھ اپنے بارے میں بھی تو اطلاع دیجئے۔ بولے "میں تو بحمداللہ پوری توانائی سے زندہ ہوں، بیشتر نظمیں گھر پر رکھی ہیں، پانچ یہ میرے سامنے والی میز کے دراز میں ہیں۔ آئیے میری زندگی کا ثبوت لیجئے۔ سُنئے اور فنون کے لئے لیجائیے۔"

میں نے مختار کی یہ پانچوں نظمیں سنیں تو مجھے یہ عجیب سا تاثر حاصل ہوا کہ مختار بہت سی نظمیں نہیں کہہ رہے ہیں ایک طویل نظم کہہ رہے ہیں اور یہ سب نظمیں اس طویل نظم کے حصے ہیں۔ میں نے اپنے اس تاثر کا اظہار بھی کر دیا تو مختار بڑی آسودگی سے مسکرائے۔ یہ آسودہ مسکراہٹ ان کے چہرے پر اس وقت نمودار ہوتی تھی جب وہ کسی دردمند سخن شناس سے اپنی شاعری کی داد پاتے تھے یا جب وہ اپنی نظمیں اور غزلیں پڑھتے خود ہی جھوم اُٹھتے تھے اور دونوں ہاتھوں کو فضا میں بلند کر کے "ہا" کی آواز کے ساتھ اپنے اندر کا سارا غبار باہر انڈیل کر ہلکے پھلکے ہو جاتے تھے میں نے اپنے اس تاثر پر مزید غور کیا تو پتہ چلا کہ مختار صدیقی کی خاص طور سے آخری پندرہ

برس کی شاعری ایک طویل ڈرامہ ہے جس کے مرکزی کردار وہ خود ہیں ان کی نظمیں اور غزلیں اس طویل ڈرامے کے اجزا ہیں اور اگر ان سب کو تاریخ وار ملا کر پڑھا جائے تو اُردو کا ایک منفرد ایپک EPIC وجود میں آتا ہوا محسوس ہوتا ہے یہ جو میں نے کہا ہے کہ مختار کے اس طویل ڈرامے کے مرکزی کردار وہ خود ہیں تو اس کا اعتراف مختار کو بھی ہے انہوں نے اپنی شاعری کو خود کلامی کہا ہے اور اپنی ذات کو اپنی روحانی کائنات کا یوں محور بنایا ہے کہ

عہد در عہد وہ صدیاں ہوئیں زندہ مجھ میں
جن میں ہم کارکن دکارگہ تھے پیہم

مسلمانوں کی عظمت وشوکت کی ان صدیوں کو مختار نے اپنی ذات کا پس منظر اُجالنے کے لئے زندہ کیا اور حق یہ ہے کہ قطعی طور پر ٹھیٹھ فن کاری سے زندہ کیا اس تہذیبی بازیافت میں انہوں نے اپنی بکھری ہوئی ذات کی بھی بازیافت کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخی اور تہذیبی اور معاشرتی زوال اور تباہی کی ترجمانی کے باوجود تعمیرِ نو کی اُمنگ کو نہ چھپا سکے یہ اُن کی حسرتِ تعمیر ہی تھی جس کی وجہ سے مجھے ان کی شاعری میں براہِ راست بات کرنے سے چڑ تھی، مجھے یاد ہے جب انہوں نے مختلف راگوں راگنیوں کو اپنی بعض بے مثال نظموں کا موضوع بنایا تو رسالہ "ادبِ لطیف" کے اڈیٹر کی حیثیت سے، میں نے ہی ان میں سے بعض کو چھاپا، اُن دنوں مختار لاہور میں نہیں تھے شاید دلی میں تھے

بعد میں اُن سے ملاقات ہوئی تو خوب ہنسے معلوم ہوا کہ وہ میری سادہ لوحی پر ہنس رہے ہیں کہنے لگے یہ نظمیں تو تمہارے نظریئے۔ ادب کی افادیت کے خلاف احتجاج تھیں میں نے کہا کہ افادیت حسن کی منکر نہیں ہے اور مجھے آپ کی ان نظموں کا حسنِ اظہار اور،

حسن خیال اپنے ساتھ بہالے گیا تو اس سے میرے ادبی نظریئے پر کوئی آنچ نہیں آتی اگر ایک نظم آپ کی شخصیت میں پھیلاؤ اور توازن اور تناسب پیدا کرتی ہے تو وہ افادیت سے مملو ہے اس پر مختار کہنے لگے کہ آہستہ بولئے۔ آپ کا کوئی ساتھی سُن لے گا تو رجعت پسند قرار دے ڈالے گا۔

مختار صدیقی اُردو کے وہ واحد شاعر ہیں جن میں ولی، سراج، شاہ حاتم نظیر، میر، سودا، مصحفی، انشا، انیس، غالب، مومن، داغ، ریاض، فانی، میراجی، غرض اُردو کے بیشتر اہم اور صاحب طرز شعرا کا لہجہ کہیں نہ کہیں سنائی دے جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی، میرا اور کبیر کا لہجہ بھی ہے۔ بلھے اور باہو کا لہجہ بھی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختار نے اردو، ہندی اور پنجابی (اور ساتھ ہی فارسی، عربی اور انگریزی) شاعری کے اساتذہ کو گھول کر پی لیا ہے، اتنے وسیع، گہرے اور گمبھیر علمی اور ذوقی پس منظر کا ثبوت گذشتہ تیس پینتیس برس میں شاید ہی کسی اور شاعر نے دیا ہو۔ اس کے باوجود مختار صاحب اسلوب شاعر ہیں اور یہ وہ منصب ہے جو علامہ اقبال کے بعد بہت ہی کم شعراء کے حصّے میں آیا ہے۔ مختار نے قدیم و جدید کو سلیقے سے آمیخت کر کے اس میں سے اپنا جدید تر طرزِ اظہار پیدا کیا آزاد نظم کو مختار نے جس جس طرح پابند کیا ہے اس سے آزاد نظم کا مستقبل تو یقیناً شاداب ہو گیا ہے مگر ایسی آزاد نظم کہنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں رہا۔ مختار نے آزاد نظم کے لئے جو منفرد سانچہ پیدا کیا ہے، وہ ہمارے مشرقی ذہن کے اس قدر قریب ہے کہ صرف پابند نظموں پر اصرار کرنے والے بھی ان آزاد نظموں کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہ اظہار کی قدرت کا ایک اعجاز ہے جس پر اس دور میں صرف مختار صدیقی ہی قادر ہو سکتے تھے۔

لاہور ٹیلی ویژن سے منسلک ہو کر مختار لاہور آئے تو مجھے اپنی نظموں کا پس منظر بتاتے ہوئے تین چار طویل ملاقاتوں میں اپنے دکھوں اپنی محرومیوں، اپنی حسرتوں اپنے معیاروں کی شکستوں کی بہت دردناک کہانی سنائی، مجھے دعویٰ ہے کہ مجھ میں خاصی معقول قوت برداشت ہے مگر جب میں نے مختار کی آپ بیتی خود ان کی زبانی سُنی تو مجھے مختار کے مقابلے میں اپنی قوتِ برداشت نہایت معمولی محسوس ہوئی اگر میں مختار کی جگہ ہوتا تو ان حالات میں میری زندگی مختار کی سلیقے سے گذرتی ہوئی زندگی سے قطعی مختلف ہوتی۔ میں برداشت نہ کرسکتا۔ مگر آخر کار مختار بھی برداشت نہ کرسکے برداشت کا یہ پہاڑ یکایک ریزہ ریزہ کیسے ہوگیا یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب مختار کی نجی اور روحانی زندگی کے علاوہ اس کی دفتری زندگی میں بھی ڈھونڈنا چاہیئے۔ آخر اس شخص کو کیسے اتنی زبردست ٹھیس لگی کہ وہ فون اُٹھا کر مجھ سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ "لالہ! چلا جاؤں؟"

مختار مجھے "لالہ" سے مخاطب کرتے تھے۔ فون کی گھنٹی بجتی تھی، میں رسیور اٹھاتا تھا تو آواز آتی تھی "لالہ"! میں کہتا تھا "جی مختار بھائی" مختار کہتے تھے "چھوڑ دوں نوکری؟ چلا جاؤں لاہور سے؟ اجازت ہے!" میں کہتا تھا "کیوں مختار بھائی۔ آپ کیوں نوکری چھوڑیں۔ کیوں لاہور سے چلے جائیں خدانخواستہ" مختار کی آواز آتی تھی "آپ ہماری امداد سے اسی طرح دست کش رہے تو جانا ہی پڑیگا۔ یہی عرض کرنا تھا" مجھے حکم دیجئے۔ میں حاضر ہوں" جواب آتا تھا "کل صبح ایک نظم چاہیئے۔ ملے گی؟" میں ڈر کر کہتا تھا "ضرور ملے گی" میں رات کو ایک نظم باقاعدہ گھڑتا تھا اور اس ڈر سے کہ مختار کی شکایت کا کرب برداشت نہیں کرسکوں گا۔ صبح بھجوا دیتا تھا۔ چند روز کے بعد پھر فون آتا تھا "لالہ۔ چھوڑ دوں نوکری؟ چلا

جاؤں لاہور سے؟ اجازت ہے؟"

مگر وہ آخری فون میرے پاس نہ آیا جس میں مختار مجھ سے کہتے: "کیوں لالہ ختم کردوں۔ یہ کھڑاگ چلا جاؤں اس دنیا سے؟ اجازت ہے؟"

میں سوچتا ہوں آخر مختار کو یہ ذرا سی بات کرنے کا بھی وقت کیوں نہ ملا؟

★ ★



حفیظ ہوشیارپوری

ناصر کاظمی

۳۲ء کی بات ہے۔ خاصی سردیاں تھیں۔ رات کا وقت تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں ایک انٹر کالجیٹ مشاعرہ تھا۔ رنگ رنگ کے طالب علم وہاں موجود تھے۔ بعض جانے پہچانے مقامی شاعر بھی تھے۔ سامعین اور ارباب ذوق سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تاجور نجیب آبادی حسب معمول کرسیٔ صدارت پر بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ہی سٹیج پر یوں تو دو تین اور بھی اصحاب تھے۔ لیکن ایک بہت دلچسپ اور عجیب سی چیز بھی تھی۔ گہرا سانولا رنگ پچکے ہوئے گال، خشک ہونٹ، سر متی برف سے بال۔ اکہرا جسم، چھوٹی چھوٹی کنچوں سی آنکھیں، کرسی پہ سے اچکتی ہوئی ہڈیوں کی ایک مالا۔ شاعر مسند پر آکر اپنا کلام سناتا۔ صاحب صدر دل بڑھاتے اور داد دیتے۔ لیکن یہ صاحب اپنی حرکتوں میں مگن تھے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے۔ شاعر ان کی طرف دیکھتا تو ایک دم سنجیدہ ہو جاتے اور سر کو نفی میں ہلا کر داد دینے لگتے۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ شاعروں کو داد ملی۔ طلباء کو انعام ملے۔ پہلا انعام جسے ملا اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ دوسرا انعام اعجاز بٹالوی کو ملا۔ میں عبدالمجید بھٹی کے ساتھ عرب ہوٹل میں آکے بیٹھ گیا۔ پھر وہاں کچھ اور لوگ جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے حفیظ ہوشیارپوری سے تعارف کرایا میں دنگ رہ گیا۔ خیر یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں۔

حفیظ نے کوئی ڈیڑھ درجن غزلیں سنائی ہوں گی۔ تاثیر صاحب نے آدھا دیوان

غالب سنا دیا۔ پھر یاد آیا کہ ان میں کچھ ان کے اپنے شعر بھی تھے۔ ایک غزل داغ کے رنگ میں تھی باقی رنگِ غالب۔ حفیظ نے میری طرف دیکھا اور پھر دیکھا۔ میں نے بھی انہیں معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ڈرتے ڈرتے دو ایک غزلیں سنائیں۔

اگلے دن میں سگریٹ لے کر کالج ہاسٹل کی طرف جا رہا تھا کہ وہی عجیب سی چیز ایک میل خوردہ گرے سوٹ پہنے ٹائی میں ننھی سی گرہ، دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے دکانوں کے بورڈوں کی طرف دیکھتے ہوئے اور گرد کی چیزوں سے یکسر بے خبر کسی کو ڈھونڈتی ہوئی نہ جانے کدھر سے کدھر کو جلدی جلدی دکھائی دی ——— جیسے کہہ رہی ہو ــ

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے

سنا ہے حفیظ خاصا پڑھا لکھا شاعر ہے۔ ہو گا! میں نے تو اس کے ہاتھ میں آج تک کبھی کوئی کتاب نہ دیکھی اور نہ ہی اسے کسی کتب خانے کی طرف جاتے دیکھا۔ جب اس نے ایک دن مجھے یہ بتایا کہ اس نے گورنمنٹ کالج لاہور سے نفسیات کا ایم اے کر رکھا ہے تو میں سنسان سا ہو گیا۔ کم از کم اس وضع قطع کا طالب علم میں نے اس کالج میں تو نہیں دیکھا، اور نفسیات نہ جانے اسے کیسے ہضم ہو گئی۔ اسے مل کر ذرا بھی تو احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک فرض شناس خاوند اور ایک شفیق باپ اور ریڈیو میں ایک ذمہ دار افسر بھی ہے۔ جب وہ پہلی بار سٹیشن ڈائریکٹر ہو کر لاہور آیا تو میں دو تین دن تک دانستہ طور پر اسے ملنے نہیں گیا۔ ایک تو اس کی نئی مصروفیات کا خیال دوسرے میں بھی ان دنوں پریشان سا تھا۔ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا اور میں پراگندہ روزی پراگندہ دل لاہور کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ سوچا اس برے حال میں حفیظ کو کیا ملوں! اس حفیظ کو جس نے مجھے کبھی بڑے آسودہ حال میں دیکھا تھا۔ اسے آئے ابھی دو دن ہی گزرے

تھے۔ رات کے کوئی ½ ۱۱ بجے ہوں گے۔ میں اپنے تاریک کمرے میں موم کی شمع جلائے کلیاتِ میر پڑھ رہا تھا۔ کہ ایک خفیف سی آواز آئی "ناصر" میں نے دروازہ کھولا حفیظ کھڑا تھا اس نے پھر کہا! ناصر" میں نے کہا! جی" اور حفیظ بولا "میں اپنا درد کہاں تک چھپاؤں گا"۔ یہ میرا ہی ایک مصرعہ ہے۔

ع ناصر میں اپنا درد کہاں تک چھپاؤں گا

حفیظ میرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے یہ مصرعہ پڑھنے کا کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈ لیتا ہے۔ پہلے میں اسے دل لگی سمجھتا تھا۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ واقعی ایک دردمند انسان ہے۔ وہ ہر آدمی سے اظہارِ دردمندی نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے اس انداز کو کوئی سمجھتا ہے۔ جب میں صاحبِ حیثیت تھا تو وہ خوش ہوتا تھا جب غریب الوطن ہو کر یہاں آیا تو اس نے مجھ سے لفظی ہمدردی بھی نہیں کی اور نہ ہی کبھی کوئی امداد کی حالانکہ وہ کر سکتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ اس نے میری غربت کا کتنا احترام کیا! بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی دوست ہو کر بھی کام نہ آئے یہ بات نہیں۔ حفیظ اول تو کبھی دوست نہیں بناتا اگر بناتا ہے تو اسے برابر کا درجہ دیتا ہے۔ وہ ذرا اذیت پسند ہے۔ دوستوں کو مصیبت میں دیکھتا ہے تو وہ بظاہر ہنستا رہتا ہے مگر اس کا دل روتا ہے۔ دراصل وہ اپنے ساتھ بھی یہی کرتا ہے۔ مجھے اس نے رسماً سہارا تو نہیں دیا لیکن گرنے بھی نہیں دیا۔ اور ایک۔۔ ایسی بھی مدد کی کہ میں آج تک اس کی بدولت چین سے دن گزار رہا ہوں۔

تقسیمِ ملک سے پہلے جب اسلامیہ کالج میں بی اے میں پڑھ رہا تھا تو ان دنوں میں بیسی ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۲۶ میں رہتا تھا۔ میرا کمرہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ماں باپ زندہ تھے۔ خاندانی جائداد قائم تھی۔ خوشی برداشت کرنیکی بڑی ہمت تھی اور ہر وقت نئے نئے غموں کی جستجو رہتی۔ ان دنوں میں اکیلا رہتا تھا۔ ویسے میں تھا بھی اکیلا ادیب و شاعر

لوگ تو کیا ہر جماعتوں سے بھی بالکل الگ۔ ویسے سب مجھے جانتے تھے یہ مجھے اب معلوم ہوا میں کمرے میں بیٹھا شاید کسی شخص کا انتظار کر رہا تھا۔ ان دنوں ایک ہی شخص کا انتظار تھا۔ وہی غالب والا "شخص" —— اتنے میں دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں نے کئی بار کہا کون؟ لیکن جواب نہ ملا۔ پھر میں اپنے دھیان میں لگ گیا۔ دستک پھر ہوئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہی چیز میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے کچھ ہنسی سی آگئی لیکن میں ضبط کر گیا ان کے ساتھ پروفیسر عبدالمجید بھی تھے جن کے ذکر کے بغیر میرے احباب کا حلقہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

"معاف کیجئے! آپ کو زحمت ہوئی" حفیظ نے بڑے پیار سے کہا۔ میری آنکھیں بھر سی آئیں۔ خوشی بھی ہوئی کہ ایک معروف سا آدمی میرے پاس خود چل کر آیا اور پریشانی بھی کہ انتظار کسی اور کا تھا۔ حفیظ نے حسب معمول وقت کم ہونے کی معذرت کی اور فوراً جیب سے ریڈیو کا کنٹرکٹ نکال مجھے دستخط کرنے کو کہا۔......... میری عمر اس وقت سولہ برس ہو گی اور میرے پاس صرف چار۔ پانچ غزلیں ہی اس قابل تھیں کہ کسی ادبی مجلس میں سنائی جا سکیں۔ میں کچھ چپ سا ہو گیا۔ پھر خیال آیا کہ حفیظ سے میری کوئی دوستی بھی نہیں کوئی تعلق بھی نہیں اور نہ ہی دنیائے ادب میں مجھے کوئی جانتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے دعوت منظور کر لی۔ وہ دن اور آج کا دن ایسی سینکڑوں ہی دعوتیں مل چکی ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایسی دعوتوں کا انتظار سا بھی رہتا ہے۔ کیونکہ رقوم کا سوال ہوتا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں کہ وہ کتنی بری گھڑی تھی جب میں ریڈیو کے مشاعرے میں شریک ہوا۔ نہ میں غزل پڑھتا نہ لوگ مجھے جانتے اور نہ ہی میری زندگی عروس سخن کے لئے رسوائے عام ہوتی۔ پھر یہ خیال کہ اور بھی تو کچھ لوگ تھے جنہیں یہ دعوت نامہ ملا تھا۔ لیکن اب ان کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ کوئی کلرک بن گیا کوئی افسر ہو گیا کوئی پاگل ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔

آل انڈیا ریڈیو میں حفیظ جب محض پروگرام اسسٹنٹ تھا تو بھی سیدھی سادی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے افسر خود چل کر اس کے کمرے میں آتے تھے۔ ا

بیں اس کے دفتر گیا۔ چپڑاسی کو چٹ دی وہ اٹھ کر ملا، سگرٹ پیش کی اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں لگا کہ شاید ڈائریکٹر صاحب کے کوئی دیہاتی رشتہ دار انہیں ملنے آئے ہیں پھر اکدم خیال آیا کہ یہ تو وہی حفیظ ہے۔ اتنا سیدھا سادا انسان میں نے اس سے اس کے دفتر کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں سنی۔ نہ کسی افسر کی تعریف اور نہ ہی بدگوئی۔ وہ لوگوں کے متعلق بہت ہی کم باتیں کرتا ہے۔ بلا کا محنتی ہے۔ صبح ۹ بجے سے چراغ جلے تک کام کرنا تو خیر اس کا معمول ہے۔ دیانت داری اور محنت سے کام کرنا یوں تو اس کی فطرت میں شامل ہے لیکن اس میں میاں بشیر احمد صاحب کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ میاں صاحب کے ۱۹۳۷ء میں انجمن اردو پنجاب میں بحیثیت اسسٹنٹ سیکرٹری کام کرتا رہا۔ اور میاں صاحب ان گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جنہیں وہ اپنا دوست سمجھنے کے علاوہ ایک نیک سیرت انسان بھی کہتا ہے۔

حفیظ کو پرانی اور نایاب کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ یہ شوق اسے اپنے بڑے بھائی راحل مرحوم سے ورثہ میں ملا۔ اسکی کتابیں دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا کہ یہ ننھی سی جان اتنی کتابیں کس وقت پڑھتی ہوگی! اس کے پاس فارسی اور اردو کے تذکرے، پرانے شعراء کے دیوان کچھ قلمی نسخے جن میں بعض واقعی کمیاب ہیں، موسیقی تصوف، صرف نحو اور لسانیات اور بعض تاریخی کتابوں سے اسکی الماریاں اٹی پڑی ہیں وہ اپنی کتابیں کسی کو نہیں دیتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ کسی کو قرض نہیں دیتا۔ مجھے اس کی یہ بات بڑی بری لگتی ہے۔ یہ ایک اچھا اصول سہی لیکن اس میں بزدلی کا ایک پہلو

بھی نکلتا ہے۔ کتابوں کا اسے بری طرح خبط ہے۔ میرے خیال میں وہ ان کی صرف ورق گردانی ہی کرتا ہے۔ چھٹی کے دن جب بھی اُسے پوچھا کہ بھائی کہاں چلے ہو تو اکثر یہی جواب ملا کہ پہلے بیوی کو کچھ رشتہ داروں سے ملانے گیا تھا، اب کشمیری بازار چلا ہوں۔ شاید کوئی کتاب ہاتھ لگے۔ ایک دفعہ میں اس کے یہاں بیٹھا تھا کہ راحل مرحوم نے اوپر سے جراَت کا دیوان بھیجا۔ یہ بڑا کم یاب اور پرانا نسخہ تھا۔ اسکی بڑی بیٹی صبیحہ نے بجلی کا پنکھا بند کر دیا۔ کہنے لگی۔ اس کتاب کے اوراق بہت بوسیدہ ہیں آپ پڑھ لیں پھر پنکھا چلا دوں گی۔" میں نے حفیظ کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ صبیحہ بلا کی ذہین ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بغیر حفیظ کی شخصیت ادھوری سی رہ جاتی ہے۔ وہ اور اس کے دوسرے بہن بھائی حفیظ کو فی ہوشیار پوری کہتے تھے۔ ماں باپ نے تو نام عبدالحفیظ رکھا تھا۔ عبدل حفیظ نے خود اڑا دیا۔ ح اور ظ بچوں نے اڑا دی۔ میں نے صبیحہ سے پوچھا کہ فی کے کیا معنی ہیں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی کہنے لگی "ایک" میں نے کہا۔ "ایک چیز" وہ شرما کر بھاگ گئی۔ صبیحہ کی فارسی دانی کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک دفعہ حفیظ نے مجھے نور عالم، انتظار حسین اور شیخ صلاح الدین کو چائے پر بلایا۔ حفیظ نور عالم کو نور قطب عالم کہتا ہے۔ صبیحہ فوراً بول اٹھی "یہ عالَم ہیں یا عالِم! اور یہ قطب ہے یا کتب" ہم سب حیران رہ گئے۔ حفیظ بھی لفظوں کا رسیا ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ اپنی بیٹی کا شاگرد ہے۔

حفیظ بڑی روکھی پھیکی بے کیف اور بعض اوقات بے معنی باتیں بھی کر لیتا ہے۔ اس کے لطیفے اتنے خشک ہوتے ہیں کہ اس کے بڑے بڑے عقیدت مند تنگ آکر ادھر ادھر جھانکنے لگتے ہیں۔ بعض تو روٹھ بھی جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اکثر یہی شک گزرا ہے۔ کہ یہ شخص بہروپیا ہے۔ اس کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ، لیکن یہ تو منافق کی تعریف ہے

وہ منافق نہیں۔

جلتے ہیں مگر دیکھ کے دل سوزیٔ احباب
یعنی سربزم فروزاں نہ ہوئے ہم

اسے تاریخ گوئی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ اور یہ فن بھی اس نے راحل مرحوم سے سیکھا، چلتے چلتے اشتہاروں کو دیکھ کر تاریخ نکال دے گا۔ آپکی باتوں میں سے تاریخی فقرے نکال دیگا۔ میں تو ایک دفعہ اسکی تاریخ گوئی سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے شادی کر لی۔ اس نے فوراً چند ایک تاریخیں کہیں۔

شاعر شہر طرب شاداں شدہ

ہر قید سے آزاد تھا ہر چند ناصر کاظمی
شادی ہوئی تاریخ ہے پابند ناصر کاظمی

ناصر کاظمی بانو
۱۹۵۲ء

صبیحہ کو جب معلوم ہوا تو اس نے فوراً کہا ——

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ یہ سارا خاندان ہی تاریخ گو ہے! اور حفیظ اردو کے علاوہ فارسی میں رواں شعر کہہ لیتا ہے۔

حفیظ میں بہت سی انسانی کمزوریاں لیکن گراوٹ کوئی نہیں۔ وہ فن کی عزت کرنا جانتا ہے۔ اچھی سے اچھی غزل سنا دی جائے گی۔ ایک شعر پہ شاعر مان نے گا ہاں ایسے علم کا قائل ہے جو اظہر من الشمس ہو صرف و نحو، عروض اور زبان پر اسے پورا عبور حاصل ہے لفظوں کا بے محل و برمحل استعمال اس طرح کرے گا کہ شاعری کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ اسکی بے کیفی اور بے رونقی کے باوجود وہ بڑا ہی گہرا انسان بھی ہے۔ وہ دوستی تو کر سکتا ہے لیکن دشمنی نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنی خشک باتوں سے لوگوں کو خاصا مایوس کر رکھا ہے۔ شاعری کا رسیا ہے۔ جب بھی فرصت ملے فکر سخن کرتا ہے لیکن داد ستند سے بالکل بے

نیا نہ ہے۔ اہم باتیں سرسری طور پر کرے گا اور معمولی باتوں کو بڑی اہمیت دے گا۔ ہر طرح سے ملنے والوں کا امتحان لے گا اور جو رائے قائم کرے گا اسے دل میں رکھے گا۔ وہ شیر کی کھال پہن کر بچوں کو ڈرانے کے بہت خلاف ہے۔ اسی لئے اسکی شخصیت بڑی نرم و نازک اور دھیمی سی ہے۔ کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ جوان ہو بوڑھا ہو یا بچہ ہو اسے کسی نہ کسی طرح چھیڑے گا۔ ہنسے گا ہنسائے گا۔ جسے ملے گا اسے احساس ہو گا کہ وہ اسی کا ہے لیکن وہ بڑا ہرجائی ہے۔ بیٹھے کہے گا۔ بھائی صاحب جواب نہیں۔ آپ حیران ہوں گے۔ کس چیز کا جواب نہیں۔ دیواروں کا جواب نہیں۔ میز کا جواب نہیں۔ باپ کا جواب نہیں۔ پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ کسی بوڑھے آدمی کی ٹوپی سے متاثر ہوا ہے۔ ایک بات کو ہر روز بے محل و برمحل اس قدر دہرائے گا کہ آپ اس کی اہمیت کے قائل ہو جائیں گے۔ سرِ مجلس آپ کو کسی نہ کسی بات پر ہنسا دے گا اور خود سنجیدہ ہو جائے گا۔ ویسے میں نے اسے روتے بھی دیکھا ہے۔ یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کار چلاتے دیکھو تو ہنس ہنس کے مر جاؤ گے۔ تنہا دیکھو تو رو پڑو گے۔

حفیظ کی غزل روایت سے آشنا ہے لیکن اسکا قالب نیا ہوتا ہے۔ دراصل وہ اپنے آپ کو روایت سے کسی طرح بھی الگ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ بہترین استاد ہے۔ غالب کو جب لوگوں نے استاد کہا تو اس نے ایک فرضی استاد ایجاد کیا۔ مجھے قسمت سے اصلی استاد مل گیا۔ اس جیسے فی البدیہہ شعر کہنے والے کم ہی دیکھے ہیں۔ انگریزی تو اس نے بھی پڑھی ہے مگر وہ خواہ مخواہ ہیئت کے تجربے کرنے کا قائل نہیں۔ بیدل اور غالب کا قائل ہے۔ ویسے میر کا نام اس نے اپنے ایک مقطع میں استعمال کیا ہے۔

نقش ہے قولِ میر دل پہ حفیظ
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے!

مگر شیخ صلاح الدین نے اسے قائل کر لیا کہ اس پر میر کا بھی اثر ہے۔ شیخ صلاح الدین کا ذکر میں نے یہاں اس لئے کیا کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جس کی بات حفیظ کبھی نہیں موڑتا خواہ وہ سچی ہو یا اس میں گھپلا ہو۔

جس زمانے میں حفیظ سے اپنی دوستی ہوئی وہ زمانہ غزل گو شعراء کے لئے بہت بھاری زمانہ تھا۔ بیسیوں میں دو چار کا کہیں کچھ بنا ہوا تھا۔ لیکن حفیظ اپنی روش پہ ڈٹا رہا۔ وہ نگیں کی طرح گھر میں گڑ کر بیٹھا رہا۔ اور اس نے اسی کنج تنہائی میں رہ کر بڑے حوصلے سے دیوانگی کی۔ شاعرانہ حال سے میں اس کا مقابلہ نہیں کروں گا غزل کے من میں کوئی بے تہہ اس کا معارض نہیں ہو سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ دور خامی نے اسے عام قبولیت کے طغرے سے ذرا محروم سا رکھا ہے لیکن اس سے اس کے مقام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے سینکڑوں ہی غزلیں لکھی ہیں۔ لیکن یہ اسی کا حوصلہ ہے کہ اس نے ابھی تک صاحب دیوان بننا نہیں چاہا۔ میں کہہ رہا تھا، کہ ان دنوں دیوں پر روایت سے بغاوت کرنے کا بھوت سوار تھا۔ وہ الٹی پلٹی باتیں لکھ کر صرف طاقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پرانی نسل کا دور تو گزر گیا لیکن ابھی ان کے نام لیوا باقی ہیں۔ بعض لوگ تو اساتذہ کی تقلید ہی کو شاعری سمجھتے ہیں۔ بعضوں کا یہ حال ہے کہ بے سر پیر کے مصرعے موزوں کر کے ہی قانع ہیں۔ اس پورے دور کے جواب میں حفیظ کا یہ شعر کافی ہے

بہت بلند ہے اس سے میرا مقام غزل اگرچہ میں نے محبت کے گیت بھی گائے

مجھے تو یوں لگتا ہے کہ حفیظ اپنے بچپن کا کوئی ساتھی ہے۔ جو بچوں کی طرح ہنستا ہے، روتا ہے اور ضد کرتا ہے۔ جب بھی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی مونگ پھلیاں نکال رہا ہو۔



رات کے مسافر

عزیز ملک

میری ملازمت کے ابتدائی دنوں کا ذکر ہے۔ مٹھو خان ہمارے دفتر کا ایک چپراسی تھا۔ میں کبھی فارغ ہوتا تو اس سے حال پوچھا کرتا۔ وہ بڑے معصوم انداز میں باتیں کیا کرتا اور چہرے پر کرب بکھیر کر کہتا۔" بابو جی اب میں آپ سے کون کتھا کہوں — مہنگائی نے کمر توڑ دی۔ سر ڈھانپیں تو پاؤں کھلے جاتے ہیں۔ داڑھی سے مونچھیں بڑھ گئیں بابو جی —— جب سے ہوش سنبھالا ہے بیچ منجدھار ہچکولے کھاتے ہیں۔ جب پیدا ہوا جرمن کا پہلا لام شروع تھا۔ میرا باپ نجو خان مشہور بین کار تھا پر نشے باز تھا۔ باہر باہر سب کچھ کھا اڑا جاتا۔ گھر میں دھیلا پیسہ کچھ دیتا نہیں تھا۔ خاک پھانک پھانک کر اور ہوا سونگھ سونگھ کر جوان ہوا۔ بہت ٹکریں ماریں کوئی ڈھب کا روزگار نہ ملا۔ باپ اچھا ہوتا تو اپنے ہی دھندے میں لگا دیتا۔ آج کل بابو جی ڈوم ڈھاریوں کی کی پھر بھی کچھ نہ کچھ عزت ہے۔ مگر عزت پر خاک ڈالو پیٹ بھر روٹی تو ملے۔ بڑی خجل خواری کے بعد دوسری بڑی لڑائی کے

دوران چپراسی کا کام ملا اور وہ بھی آپ کے محکمے میں۔ دن بھر دفتر مشقت اٹھاؤ اور شام کو افسروں کے بنگلے میں حاضری دو۔ کنگلے جو ٹھہرے صفائی دھلائی کے لئے بلا لیتے ہیں۔ دہاتی ہے بالو جی ہم تو دنیا میں آ کے بھر پائے۔ اپنی تو کوئی چول بھی ٹھیک سے نہیں بیٹھی۔ بالو جی شادی ہوئی تو وہ بھی دھوکے سے۔ دکھائی اور بیاہ کر دی دوسری۔ اب بچے ہوتے تو ایک ساتھ دو۔ دونوں سالا لڑکی۔"

استاد یوسف ظفر آخری فقرے تک بمشکل پہنچتا کہ میں قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا اور پھر بات سے بات کا سلسلہ چل نکلتا۔

برسوں ہمارا یہ روز مرہ رہا کہ دن ڈھلے جب چراغ جلتے ہماری صبح طلوع ہوتی اور ہم دونوں بازار کی سیر دیکھنے نکلتے۔ سڑک حکیموں کے مجمعوں میں لگ جاتے اور دانائی سے بھرپور باتیں سن کر اپنے شعور کو چمکاتے۔ ریڑھی والوں سے بھاؤ تاؤ اور مول تول کرنے والوں کو دیکھتے، پھر کسی تھڑے پر بیٹھ کر چاٹ اڑاتے کہیں سے قلفیاں کھاتے اور آگے بڑھ جاتے ــــــــــــ

اس طرح افکار کی یلغار سے دم بھر کو فرار کی مہلت مل جاتی۔

کسی روز مجھے خلاف معمول خاموش پا کر وہ کہتا۔ کوئی گل سناؤ بھائی جی کی حال چال اے"؟

اور میں اسے اپنی کتھا سناتا۔ استاد آشفتگیِ حال آج ورائے قیل و قال ہے کیوں کہ دانت کے درد سے جینا محال ہے

اور ——— ! اور وہ بات کاٹ کر کہتا — "اور اے یارِ لایزال سن کہ عالم تمام حلقۂ دامِ وبال ہے کیوں کہ طبیعت میری بھی دردِ دنداں سے نڈھال ہے۔"

یہ کہتے ہوتے وہ اپنے سوجھے ہوئے رخسار کا رُخ میری طرف گھماکر اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ تیز بیں نگاہیں مجھ پر گاڑ دیتا۔

اس پر مجھے کہنا پڑتا۔ "استاد تم سے غمخواری کی طلب میں کون اپنا دکھ درد کہے کہ تم بھی ضرور کسی مماثل روگ میں مبتلا پائے جاتے ہو

ہوتی جن سے توقع خستگی میں داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ الم نکلے

شکر نہیں کرتے بھائی جی میں تمہارا درد بانٹنے کی عملی کوشش کرتا ہوں"۔ وہ فخر کے ساتھ مجھے مخاطب کرتا۔

میں جواب دیتا۔

استادِ زماں، درد مشترک سہی مگر تم نے تو ورم کو داڑھی کی اوٹ میں چھپا رکھا ہے اور میری سوجن میرے چہرے پر بول رہی ہے۔

"بس تم بھی ذرا داڑھی رکھ لو"۔ وہ نیک مشورہ دیتا۔

میں معذرت کے انداز میں کہتا۔" مگر استاد جی میرے بال نزلے کے کارن اتنی سرعت سے سفید ہوئے جاتے ہیں جیسے سندربن کے حاشیوں پر ایکا ایکی سویرا نمودار ہو جائے۔ چنانچہ

اس عیب کو چھپانے کی خاطر ہر صبح سیون دکلاک کی مدد سے کھونٹی نکالنے مجبور رہوں۔"

وہ بیچ میں بول پڑتا ——— نہیں بھائی جی نزلے والی بات غلط ہے۔ اصل ماجرا کچھ اور ہے۔ تم خوش نصیب ہو ابھی تمہاری والدہ حیات ہیں ان کو آج یہ مصرعہ سنا ؏

دودھ تیرا میرے بالوں کی سفیدی ہوگیا

اتنے میں پھل والے کی دکان پر پہنچ کر ہم رک جاتے اور وہ مجھ سے پوچھتا۔" مالٹے کا رس کیسا رہے گا بھائی جی"

میں اس حسنِ انتخاب کی دل کھول کر داد دیتا کہ استاد اللہ تمہیں خوش رکھے۔ دانت درد کی ٹکور کا بے پناہ نسخہ تجویز کیا ہے۔ اس وقت ایک ایک گلاس چڑھالیں تو ساری کائنات اللہ ہو۔ اللہ ہو کر کے داخل حسنات ہو جائیں۔

"مگر پھلوں کی افادیت بھی تو کچھ ہوگی؟

وہ پوچھتا۔

میں اسے بتاتا کہ پھل بجائے خود حامِل لطافت ہوتے ہیں اور ان کا رس الطف یعنی لطیف تر ہوتا ہے اور لطافت کا تقاضہ ہے کہ سریع الھضم، صالح الغذا اور جید الکیموس ہو ——— ماضی قریب میں ایک رمز آشنا بزرگ گزرے ہیں جنہیں مہاتما گاندھی کہا جاتا تھا۔ انہوں نے پھلوں کی افادیت کا راز پالیا تھا۔ مدت العمر فواکھات کے تازہ افشردہ اور بکری کے دودھ پر قناعت کرتے

رہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی عہد آفریں اور تاریخ ساز بکری کو پانچ سیر بادام اور ایک تولہ زعفران کا نقل روزانہ کرایا کرتے پھر اس کا کیمیائی دودھ، بھارت نواسیوں اور دھرت ماتا کے غم میں نوش جان فرماتے۔ اب ایسی پرہیزی غذائیں کھانے والے وضعدار لوگ اس جہانِ ہفت رنگ سے دھیرے دھیرے ناپید ہو گئے ؏

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

استاد توجہ سے میری منطق سنتا اور مسکرا کر مالٹے کے رس میں کچھ دیر کے لئے گم ہو جاتا۔ پھر مہر سکوت توڑتے ہوئے کہتا

بھائی جی تم کھونٹی نکالنے کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے یہ تاریخی حقیقت ہے کہ فرنگی اس دھرتی سے جاتے جاتے ہر شخص کو نائی بنا گیا ہے۔ جیسے دیکھو نور کے تڑکے سیفٹی ریزر لئے بیٹھا ہوگا۔

میں استاد کی تائید میں کہتا —— ہاں یقیناً محض اصطلاحی مفہوم ہی میں نہیں بلکہ معنوی اعتبار سے بھی اس معمورۂ خاکی میں بسنے والے ہر مخلص انسان حجامت بنانے کے فن میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں۔ اور جب بھی موقع ملتا ہے دوسروں کی ٹنڈ رگڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اتنے میں رس کے گلاس خالی ہو جاتے اور ہم اگلے پڑاؤ کی جانب روانہ ہو جاتے۔

راستے میں ایک دکان کے انگریزی حروف میں لکھے بورڈ

کی بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ کہتا کہ لکھوانے والے نے اپنی طرف سے "طاہری مارٹ" لکھوایا ہے مگر انگریزی ابجد کے دروبست نے "طاہری" کو "ٹیڑھی" بنا کر رکھ دیا ہے۔

اصل میں استاد کو بورڈ پڑھنے میں کمال حاصل تھا اس کے اس وصف پر مجھے رشک آتا اور میں دعا مانگا کرتا۔ بارے الٰہی مجھے بھی بورڈ پڑھنے کی ایسی ہی صلاحیت عطا کر دے۔

ایک رات اس نے "رومر" ٹریڈ مارک کے سائن بورڈ کو پڑھ کر یہ تشریح کی تھی کہ "رومر" اسم بامسمیٰ ایجاد ہے اسے خریدنے کے بعد آدمی پہلے روتا اور پھر مر جاتا ہے۔ غالب نے درست کہا تھا کہ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں۔

ایک دفعہ اس نے ہمدرد دواخانے کے انگریزی میں لکھے ہوئے بورڈ کا صحیح املا سنایا اور شربتِ "روح افزا" کو "روحانفظا" بنا کر اپنے دوست حافظ لدھیانوی سے بے تحاشہ داد وصول کی تھی۔

پھر ایک رات کسی تقریب میں شرکت کے بعد ہم دونوں سٹی صدر روڈ پر آ رہے تھے۔ ایک نستعلیق بورڈ میری نظر سے گزرا جس پر میاں "فضّل" کریم لکھا تھا۔ میں نے استاد کی توجہ مبذول کرائی کہ لام کو مشدّد لکھوا رکھا ہے۔ استاد کہنے لگا ضرورت سے زیادہ متروکہ مال ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ دیکھتے جاؤ چند دنوں میں کریم کو بھی بڑے قاف سے لکھوا کر "فضّلِ قریم" بنا دے گا۔

برسات کی رُت میں ایک رات ہمیں بارش نے آ لیا اور مال روڈ کی ایک بند دکان کے برآمدہ میں رُکنا پڑا۔ ہوا اور مینہہ کے تیز تھپیڑوں سے جو صوتی نغمہ پھوٹ رہا تھا ہم اس کا لطف اٹھاتے رہے ——— دفعتہً استاد نے جھرجھری لی اور کہنے لگا ——— بھائی جی کوئی تیس برس پہلے برسات کی ایسی ہی ایک رات تھی میں مزنگ سے چوبرجی تک موسلا دھار بارش میں بھیگتا چلا گیا۔ عجیب سماں تھا کہ ابرِ باراں کا ساز و آہنگ میرے دل پر وارد ہونے لگا اور ایک نظم موزوں ہو گئی۔

یہ مینہہ برساتی راتیں
ہر بوند میں ایک ترنم
یہ ہنستی گاتی راتیں
ہر لے میں تم تم تُم تُم

بے تم ہوں کیسے باتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

چھاتوں پر رِک ٹِک رِک ٹک
کپڑوں پر رس لس رس لس
پتّوں پر نِک نِک نِک
اور در پہ بے کس بے کس

میں بے کس اور برساتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

موٹر پر آؤں آؤں
تانگے پر ٹھنک ٹھنک شاں شاں
میں کیسے بات بتاؤں
سب الفت کے ہیں عنواں

سب الفت کی ہیں گھاتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

کوٹھے پر تھم تھم، تھم تھم
شیشوں پر ٹن ٹن ٹن ٹن
گرنے میں چھم چھم، چھم چھم
ہے دل پر تجھ بن تجھ بن

اور تجھ بن ہیں برساتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

کوچوں میں سر سر، سر سر
چھجوں پر چھل چھل چھو چھو
نالوں میں کھر کھر، کھر کھر
اور فرش پہ میں ہی تُو تُو

یہ میں اور تُو کی باتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

ٹپ، ٹپ، ٹپ ٹپ ٹپ چھت پر
کیچڑ پر تر تر دل دل

بوندوں میں خوش ہو خوش کر
میں بے کس اور تُو بے کل

ساون یہ سو صلوآتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

استاد اپنی موج میں نظم سناتا چلا گیا اور برستے بادل کی گنگناتی بوندوں سے یہ صدا آتی رہی ؎

استاد عظیم ہے خدایا

ساون کا بادل گھر کے آیا گرجا برسا اور نکل گیا۔ تاریک ابر کی میلی چادر مفلس کے لباس کی طرح شکستہ ہو گئی۔ ابر کے ٹکڑے پارہ پارہ ہو کر بکھرنے لگے اور ان کی گود میں چاند تیرتا نظر آیا۔ ستارے چمک کرتے دکھائی دیئے۔ ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور ہماری حیاتِ بے ثبات کے سفر کی اور ایک رات چپکے سے گزر گئی۔

اور پھر ایک روز ہمارے طویل سفر کی آخری رات آ گئی۔ جس لمحے اسے سپردِ خاک کر کے لوٹے ہیں بارش شروع ہو چکی تھی۔ بادل رات بھر میرے ساتھ مل کر آنسو بہاتا رہا اور یہ نالۂ اندوہگیں میرے کانوں سے ٹکراتا رہا ؎

میں بے کس اور برساتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

★ ★

سمندر خان سمندر

باقی صدیقی



یہ مئی ۱۹۵۲ء کی بات ہے مجھے راشد صاحب کا تار مِلا اور میں اسی دن پشاور پہنچ گیا جس سے مجھے دیرینہ نسبت ہے اس لئے پشاور شہر مجھے بہت پسند ہے میں نے بچپن کے قریباً آٹھ سال اسی فضا میں گزارے ہیں میرے والد صاحب ریلوے میں ملازم تھے اور ان کی ملازمت کا زیادہ حصّہ سرحد ہی میں گزرا ہے میں جب بھی اٹک کے پار جاتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے علاقے میں آگیا ہوں سرحد میں قدم رکھتے ہی پیر پیائی کا چھوٹا سا اسٹیشن میرے ذہن میں ابھرتا ہے یہ اسٹیشن میرے والد صاحب کی آخری منزل تھی ۔ میں جب بھی پشاور جاتا ہوں اس اسٹیشن کو ضرور دیکھتا ہوں اور بچپن کی معصوم یادیں چند لمحوں کے لئے مجھے دنیا کے ہنگاموں سے دور لے جاتی ہیں ۔ میری نظم "بازگشت" اسی اسٹیشن سے متعلق ہے میں نے کئی دفعہ پشاور میں قیام کی کوشش کی ہے مگر قسمت نے میرا ساتھ نہیں دیا ریڈیو کی ملازمت سے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب میری خواہش پوری ہو گی پشاور ریڈیو کا ماحول بہت اچھا تھا ۔ ن م راشد سٹیشن ڈائریکٹر تھے جو اپنی شاعر برادری کا خیال بہت رکھتے تھے ۔ حامد عزیز مدنی اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر تھے اور جو لوگ مدنی صاحب کو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ وہ افسر

نہیں صرف شاعر ہیں ہم چار سکرپٹ رائٹر تھے سید ضیاء جعفری، باسط سلیم صدیقی احمد فراز اور میں خاطر غزنوی ان دنوں اکاؤنٹ سیکشن میں تھے مگر حساب کتاب سے زیادہ پروگراموں میں دل چسپی لیتے تھے ضیا جعفری کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ یہ حسن کے ایک درویش صفت شاعر ہیں اور اپنی وضع پر آج تک قائم ہیں زمانے کا کوئی رنگ ان کو اپنی منزل سے نہیں ہٹا سکا، احمد فراز سے بھی شوکت واسطی اور حفیظ اثر کے ذریعے تعارف ہو چکا تھا۔ شوکت واسطی اور حفیظ اثر بھی پشاور کی ادبی فضا پر قابض تھے ادب ان کا موضوع گفتگو تھا ہنگامے ان کی عادت اور مشاعرے ان کا اوڑھنا بچھونا دشمنوں سے دوستوں کی طرح ملنا اور دوستوں کو دشمن بنانا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا کبھی اردو سبھا کے مشاعرے بڑے بڑے لوگوں کے ہاں ہوتے تھے جن میں لذت کام و دہن کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اس لئے بعض شرائی پارٹی سمجھ کر ان میں حصہ لیا کرتے تھے محسن احسان اسی ہنگامے کی سلجھی ہوئی آواز ہے احمد فراز بھی اسی سے ابھرا ہے۔ احمد فراز پہلے احمد شہر تھا اسے ابھی زبان نہیں ملی تھی اس وقت میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس احمد شہر میں سے اتنا تیز طرار احمد فراز نکلے گا باسط سلیم سے پہلی دفعہ تعارف ہوا تھا مگر اس کے خلوص نے جلد ہی اجنبیت کے پردے ہٹا دیئے یہ تینوں حضرات ریڈیو کے کام میں بہت ماہر تھے میں جب باسط سلیم کو ڈرامے لکھتا دیکھتا تو سوچنے لگتا تھا کہ اگر ریڈیو میں اس طرح لکھا جاتا ہے تو میں یہاں نہیں چل سکوں گا وہ صبح نو بجے قلم لے کر بیٹھتا اور شام کو پونے گھنٹے کا ڈراما لکھ کے اٹھتا احمد فراز بھی اپنے کام میں بہت تیز تھا مگر یہ شاہین مشکل سے زیر دام آتا ریڈیو والے اس سے سخت نالاں تھے مگر جب یہ لکھنے بیٹھ جاتا تو تقریریں غنائیے اور ڈرامے اس کے قلم میں سمٹ

آتے تھے ضیاء صاحب بھی اپنے کام میں مہارت رکھتے تھے صرف میں نوگرفتاروں میں تھا فیچر لکھنے کی اتنی مشق نہیں تھی اس لیے معمولی مسودہ بھی کئی بار لکھتا تھا۔ یعنی میں لکھتا کم تھا اور کاغذ زیادہ ضائع کرتا تھا ہمارا کمرہ کینٹین کے ساتھ تھا اس لئے بار بار چائے کا دور چلتا تھا۔ ویسے بھی ریڈیو سٹیشنوں پر چائے زیادہ پی جاتی ہے ایک میان میں دو تلواریں یقیناً نہیں سما سکتیں اور شاعر و ادیب بھی تلواروں سے کم نہیں ہوتے مگر یہ پشاور کی فضا کا اثر تھا کہ ہم چاروں سکرپٹ رائٹر ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ ہمارے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہیں ابھرا راشد صاحب آفیسر ہونے کے باوجود ہم سے دور نہیں رہ سکتے تھے انہیں جب بھی وقت ملتا تھا ہمارے کمرے میں آجاتے اور کبھی ان کے کمرے میں ہم جب ہو جاتے فراز کے فقرے دفتر میں بھی محفل کا رنگ بھر دیتے تھے وہ راشد صاحب کو بھی معاف نہ کرتا تھا جب راشد صاحب امریکہ گئے تو پشاور کے ہوائی اڈے پر فراز نے انہی کی نظم کا ایک شعر ان پر چسپاں کر دیا۔

چلی تو تجلۂ انگور سے ہے طنازہ
یہ ڈر ہے کوچہ و بازار میں نہ رسوا ہو

راشد مسکرا کر رہ گئے۔

حامد عزیز مدنی جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے صرف شاعر ہیں دوسروں کی عزت کرنا ان کی گھٹی میں شامل ہے برہم ہوتے تو بھی مسکراتے دکھائی دیتے سلام میں سبقت لے جانا کوئی ان سے سیکھے میں سنبھلتا رہتا تھا اور وہ سلام کر کے دوسرے کمرے میں غائب ہو جاتے تھے ریڈیو اسٹیشن سے باہر ابھی ادبی رسہ کشی شروع نہیں ہوئی تھی فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کا حجرہ پشاور کے شعراء کا

اڈہ تھا۔ نذیر مرزا برلاس، ضیا جعفری اور خاطر غزنوی بلا ناغہ آتے تھے ان لوگوں کی ایک آواز بھی ایک مقصد تھا کوئی کسی کا حریف نہیں تھا ہر اختلاف قہوے کی پیالی اور قہقہوں کی گونج میں دب جاتا تھا ان چراغوں سے کئی نئے چراغ جلے ہیں مرزا محمود سرحدی بہت کم ملتا تھا مگر جب ملتا تھا تو سارے گلے دھو جاتا تھا اسکے شعروں کی طرح اسکی ہر ادا تیکھی تھی وہ یا دوست تھا یا دشمن درمیانی رشتہ اسے پسند نہیں تھا مزاحیہ شاعری میں بڑے بڑے مزاح نگار اس کے سامنے بونے نظر آتے ہیں پشتو ادیبوں میں سے سمندر خان اور اجمل خٹک ریڈیو سے وابستہ تھے اجمل خٹک کا بلے بلے ڈگ بھرتے آنا اور مسکراتے ہوئے لپٹ جانا مجھے کبھی نہیں بھول سکتا یہ سیدھا سادہ سا پٹھان شاعر بہت خوبیوں کا مالک ہے بڑے بڑے طوفانوں سے مسکرا کے گزر گیا ہے میں نے کبھی اس کے ماتھے پر بل نہیں دیکھا۔

میں کسی ایک ضروری کام کے لئے پبلسٹی سیکشن میں گیا تو ایک بزرگ پر نظر پڑی جو کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے سرخ سفید رنگ خوبصورت داڑھی سر پر پشاوری لنگی چہرے پر فن کارانہ عظمت میرے استفسار پر معلوم ہوا کہ سمندر خان ہیں سمندر خان کا نام سنتے ہی مجھے انصار ناصری صاحب کا وہ مضمون یاد آ گیا۔ جو "ماہ نو" میں چھپا تھا اسی اثنا میں تاری تجمل حسین نے میرا تعارف کرایا یہ ہماری پہلی ملاقات تھی جو رسمی گفتگو سے آگے نہ بڑھ سکی اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے ریڈیو کے برآمدے میں ملاقات ہونے لگی وہ جب بھی ملتے نہایت تپاک سے ہاتھ ملاتے اور خلوص سے حال پوچھتے ان کی اس نوازش نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں ان کے قریب آنے کی کوشش کرنے لگا مگر معروفیت کی وجہ سے

مل بیٹھنے کا موقع نہ ملا۔

ایک دن بستی صدر روڈ پر ان سے ملاقات ہو گئی ان سے معلوم ہوا کہ آج اُولسی جرگہ (پشتو انجمن) کا اجلاس ہے ہم باتیں کرتے ہوئے لینڈ ڈاؤن سینما کے پاس پہنچ گئے جب میں نے اجازت طلب کی تو مسکرا کے کہا "غریب خانہ نزدیک ہے اتفاق سے آ گئے ہو تو دیکھتے چلو" میں چپ چاپ ساتھ ہو لیا جیسے اسی حکم کا منتظر تھا جب میں سمندر خان کے کمرے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے میری نظر ان کی تصویر پر پڑی جس کے نیچے یہ شعر لکھا تھا۔

دَکولال دَلاس ہنر دے
دَے کوزہ کښں سمندر دے

(یہ کمہار کے ہاتھ کا ہنر ہے اور اس کوزے میں سمندر ہے)

سمندر خان کو بستی صدر روڈ پر ریڈیو کے کوارٹرز میں سے ایک کوارٹر ملا ہوا ہے کوارٹر مختصر سا ہے مگر ان کی ضرورت کے لیے کافی ہے کیونکہ وہ اس میں تنہا رہتے ہیں کمرے کی چیزوں سے ان کی سادگی نمایاں ہے دیواروں پر دو قدرتی مناظر کی تصویریں ہیں آتش دان کی کارنس پر ایک ٹائم پیس ہے اور دو سیاہ بگلے نظر آتے ہیں آتش دان کے پاس ایک چھوٹا سا قالین بچھا ہے ایک کرسی اور دو تین میز ہیں کمرے میں دو الماریاں ہیں جو ان کی کتابوں سے بھری ہوئی ہیں چارپائی کے سامنے جو میز ہے اس پر ٹیبل لیمپ کے علاوہ چاقو پنسلیں قلم اور کالی روشنائی کی ایک دوات نظر آئے گی ساتھ ہی ایک کسوٹی ہے جس سے وہ سوتا پرکھنے کی بجائے چاقو تیز کرنے کا کام لیتے ہیں یہ کمرہ چھوٹا سا ہے مگر سمندر خان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے میں نے کچھ دیر بعد اُولسی جرگہ کے متعلق استفسار کیا

تو کہنے لگے میں نے پشتو میں عروض کی ایک کتاب لکھی ہے پہلے چند کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور پھر ہر بحر میں طبع آزمائی کی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ پشتو زبان کے الفاظ اپنی ساخت اور تلفظ کے اعتبار سے یہ پابندی قبول کر سکتے ہیں یا نہیں جب پوری طرح تسلی ہو گئی تو ایک کتاب مرتب کی اُولسی جرگہ میں وہی کتاب تنقید کے لئے پیش کی گئی تھی انہوں نے بتایا کہ پشتو کا ایک اپنا آہنگ ہے جس کا شاعری میں سہارا لیا جاتا ہے مگر میرے خیال کے مطابق عروض ضروری ہے اس لئے میں نے عربی عروض کو اپنانے کی کوشش کی میں نے پوچھا کہ بحث کس نتیجے پر پہنچی فرمایا بعض شعراء اس کام کو مستحسن قرار دیتے ہوئے بھی اس کی تقلید کرنے پر آمادہ نہیں ان کا یہی اعتراض ہے کہ پشتو شاعری کا حسن اس کے اپنے آہنگ میں ہے مگر ایسا نہیں میں نے مروجہ بحروں میں کئی ہزار شعر کہے ہیں اور آج تک کوئی ایسا لفظ نظر نہیں آیا جو ان بحروں میں آکر اپنی ساخت یا حسن کھو بیٹھا ہو یا اس کے تلفظ میں فرق آگیا ہو یہ محض بہانہ ہے پشتو شعراء جان بوجھ کر اس سے گریز کرتے ہیں کیونکہ یہ کارنامہ مجھ سے منسوب ہے شاید یہی وجہ ہے کہ سمندر خان جب بھی کسی مشاعرے میں نظم پڑھتے ہیں تو آخر میں اس کی بحر کے ارکان ڈرامائی انداز میں بتاتے ہیں جب ان کے کلام کا ذکر آیا تو انہوں نے الماری کھول کر میرے سامنے آٹھ دس موٹی موٹی کاپیاں رکھ دیں تمام بیاض نہایت صاف ستھرے اور خوبصورت انداز میں لکھے ہوئے تھے سمندر خان کے بیاض دیکھ کر مجھے اپنی حقیقت ایک قطرے سے کم نظر آنے لگی میری نگاہیں غیر ارادی طور پر ان کی تصویر کی طرف اٹھ گئیں اور یہ شعر از سر نو میرے دماغ پر چھا گیا۔

دَ کولال وَلاس ہنر وے   وَے کوزہ کښں سمندر دے

میں جب سمندر خان کے کمرے سے نکلا تو میری نظروں میں ان کے بیاض گھوم رہے تھے میں نے سوچا میں اپنی پچاس غزلیں چھپوانے کے لئے کتنا بیتاب ہوں اور سمندر خان اپنے استنے بیاض دل سے لگائے کتنے حوصلے سے جی رہے ہیں۔

اس ملاقات نے میرا حوصلہ بڑھا دیا اور میں کبھی کبھی ملاقات کے لئے جانے لگا ایک دن میں نے کہا کہ میرے آنے سے آپ کا حرج تو نہیں ہوتا۔ کہنے لگے "یرا حد کرتے ہو تم آجاتے ہو تو میں بھی دل کی باتیں کر لیتا ہوں گو میں تنہائی پسند ہوں کیونکہ دوستوں کے ہاتھوں وہ دکھ اٹھائے ہیں کہ کسی سے ملنے کو جی نہیں چاہتا پھر بھی کبھی کبھی اپنے جیسے دیوانے سے ملنے کو ترستا ہوں میں اس عمر میں بھی محبت اور خلوص کا بھوکا ہوں چونکہ تم میں اور مجھ میں بعض باتیں مشترک ہیں اس لئے تم سے مل کے خوشی ہوتی ہے میں نے کہا جب ایک شاعر کسی شاعر سے ملتا ہے تو اس ملاقات میں شعر دل کا دخل بھی ہوتا ہے میرے اشعار تو آپ سمجھ لیں گے مگر میں اس نعمت سے محروم رہوں گا پشتو پڑھنا شروع کیا تھا تو ایک لیفٹیننٹ (یوسف رجا) جو اگر دوست نہیں تو دشمن بھی نہیں چند دن پڑھانے کے بعد غائب ہو گیا اب سوچتا ہوں اس منزل کا رہنما کیسے بناؤں پشاور میں رہ کے پشتو سے محروم رہنا مناسب نہیں اس طرح میں شعر کی روح تک نہ پہنچ سکوں گا آپ سے درخواست کرنے کو جی چاہتا ہے مگر حوصلہ نہیں ہوتا یہ سن کر سمندر خان نے کہا مجھے پڑھانے میں کوئی اعتراض نہیں مگر میں اردو زبان پر حاوی نہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری صحیح رہنمائی نہ کر سکوں میں نے کہا جہاں ہو سکے آپ میری مدد کریں آگے دیکھا جائے گا جب وقت کے تعین کا سوال آیا تو کہنے لگے میرا پروگرام یہ ہوتا ہے صبح نماز کے بعد دفتر

کا کام کرتا ہوں تقریباً گیارہ بجے دفتر جاتا ہوں وہاں سے ایک بجے بعد واپسی ہوتی ہے تین بجے تک ذاتی کام کرتا ہوں پھر سیر کے لئے نکل جاتا ہوں اور مغرب کی نماز کے بعد آتا ہوں اور تم اس وقت آجایا کرو تمہیں پڑھا کے خوشی ہوگی۔

دوسرے دن جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ چارپائی پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے میری آمد پر مسرت کا اظہار کیا میں نے پوچھا یہ کیا لکھ رہے ہیں؟ انہوں نے موٹی سی کاپی لحاف پر رکھتے ہوئے کہا قطعات نقل کر رہا ہوں پہلی کاپی خراب ہوگئی تھی خیال آیا کہ دوبارہ لکھنا چاہیئے "میرا" میں لکھنے سے تھکتا نہیں گو اس محنت نے میری صحت پر برا اثر ڈالا ہے مگر یہ جنون کسی طرح کم نہیں ہوتا جب بھی وقت ملتا ہے لکھنے بیٹھ جاتا ہوں میں نے کاپی اٹھا کر دیکھی تو حیران رہ گیا ہر قطعہ کتابت کا بہترین نمونہ ہے سارے قطعے کالی روشنائی سے نہایت خوشخط لکھے ہوئے تھے خوشخط اور خوبصورت انداز میں لکھنا بھی سمندر خان کے فن کا ایک حصہ ہے۔ بعض قطعے تو عجیب انداز میں لکھے ہوئے تھے کوئی ترچھے کوئی سیدھے کوئی گول دائرے کی صورت میں کوئی کمان کی طرح ایک قطعہ صراحیوں کی شکل میں لکھا ہوا تھا یعنی ہر مصرع ایک صراحی کے اندر سجا تھا فن کی یہ لگن دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا میرا نے لوگوں ہی میں یہ بات پائی جاتی ہے جگر مراد آبادی مرحوم میں بھی یہ وصف تھا جب میں نے بار بار تعریف کی تو مسکرا کے کہا "میرا" یہ کوئی کمال نہیں پاگل پن ہے کتاب کھولو تو تمہیں سبق پڑھاؤں۔

اب میں باقاعدہ حاضر ہونے لگا میں جس وقت کمرے میں داخل ہوتا تو وہ مخصوص انداز سے "آیئے آیئے" کہتے ہوئے اور اپنے ضروری کام چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو جاتے پڑھنے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگتیں۔ سمندر خان

کی گفتگو سیدھی سادی اور بناوٹ سے پاک ہوتی ہے گفتگو کے دوران اُن کے چہرے پر مسکراہٹ چھائی رہتی ہے جس سے ان کے بزرگانہ جلال میں اضافہ ہو جاتا ہے وہ اپنے لطیفے سُنا کے نہایت سادگی سے ہنستے ہیں انہوں نے مجھ سے کسی پہلو کو چھپانے کی کوشش نہیں کی شروع شروع میں وہ مجھے سڑک تک چھوڑنے کے لیے آتے رہے مگر جب ربط بڑھا تو ایک دن کہنے لگے چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں اور پھر ہوٹل تک میرے ہمراہ آئے اس کے بعد ہم کبھی کبھی دسمبر اور جنوری کی سرد راتوں میں مال روڈ پر سیر کیلیے نکل جاتے اب سمندر خان سے مجھے محبت ہو گئی تھی ان کے بغیر مجھے ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا۔

سمندر خان جس مکان میں رہتے ہیں وہ ستی صدر روڈ سے ذرا ہٹ کے ہے سڑک پر آمنے سامنے دو ہوٹل پوری آب و تاب سے رات کے دس بجے تک کھلے رہتے ہیں ان دونوں ہوٹلوں میں ریکارڈ اس بے رحمی سے بجائے جاتے ہیں کہ الاماں ایک دن میں نے ان سے کہا یہ شور آپ پر اثر نہیں کرتا فرمانے لگے پہلے تو بہت گراں گزرتا تھا مگر اب عادی ہو گیا ہوں وہ اپنا کام جاری رکھتے ہیں اور میں اپنا کام۔

سمندر خان نے اپنی زندگی میں زمانے کے کئی اتار چڑھاؤ دیکھے مزدوری کی چپڑاسی بنے تانگہ چلایا بیرے کا کام کیا شعبدہ باز کہلائے اور آخر میں ریڈیو کے دامن میں پناہ ملی سمندر خان اپنے ہر دور کا ذکر بڑی بے تکلفی سے کرتے ہیں اور یہ ان کے بلند کردار کی نشانی ہے سمندر خان نے کافی عرصہ بیرے کا کام کیا ہے یہ کام ایک خاص تحریک کے سلسلے میں شروع کیا گیا تھا جس کا ذکر اب ضروری نہیں۔
اسی دور میں ایک انگریز نے انہیں شعبدہ بازی کی طرف مائل کر لیا اور وہ کئی سال

تک مختلف یونٹوں میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے رہے تانگہ چلانا اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ نوشہرہ چھاؤنی میں ایک رات ایک گورا انہیں کھوٹی اٹھنی دے کر بھاگ گیا تھا اور وہ ان کی سارے دن کی کمائی تھی مزدوری میں بھی نفاست کا خیال رہتا تھا۔ دو بوریاں سلیقے سے اوپر نیچے رکھتے تھے ظاہر ہے مزدوری سے اس بات کا کوئی تعلق نہیں طبیعت میں غصے کی وجہ سے زیادہ دیر چپڑاسی بھی نہ رہ سکے۔ یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک پنجابی بیرے علی محمد سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے وہ اکثر ان کے پاس آیا کرتا تھا سمندر خان کہتے ہیں وہ جب بھی میرے پاس آتا میرے بیاض کو جس پر "دیوانِ سمندر" لکھا تھا بہت غور سے دیکھتا۔ وہ کہتا تھا میں بھی پنجابی کا شاعر ہوں مگر کبھی اس کی زبانی کوئی شعر نہیں سنا تھا ایک دن اس نے چند احباب کو دعوت دی جن میں میں بھی شامل تھا میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے میری نظر میز پر رکھی ہوئی ایک چیز پر پڑی جو رومال سے ڈھکی ہوئی تھی میں اسے کھانے کی کوئی چیز سمجھا میری نظر بار بار میز کی طرف اٹھنے لگی تو علی محمد بھانپ گیا اور مسکرا کے کہا میرا دیوان ہے اس کے بعد ہیر وارث شاہ جتنی موٹی کاپی میرے ہاتھ میں تھی جس کی جلد پر "دیوان علی محمد" لکھا تھا اتنا بڑا دیوان دیکھ کر میں مرعوب ہو گیا اور سوچنے لگا کہ یہ واقعی بہت بڑا شاعر ہوگا مگر جب میں نے کاپی کھول کر دیکھی تو وہ کوری تھی میں نے علی محمد کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا شاعر بننے کا یہ جذبہ ہر دور میں عام رہا ہے اس دور میں بھی کئی علی محمد شاعر بننے کے تصور میں کوری کاپیاں لئے پھرتے ہیں اور بعض ان میں کورے شعر بھی لکھ لیتے ہیں۔

سمندر خان ایک مدت سے ریڈیو پاکستان پشاور میں سکرپٹ رائٹر کی

حیثیت سے کام کر رہے ہیں اس عرصے میں انہوں نے کیا کچھ لکھا ہے اس کا اندازہ وہ خود بھی نہیں لگا سکتے ریڈیو کا ادیب کتنا لکھتا ہے کس طرح لکھتا ہے اور کیا لکھتا ہے یہ ایک الگ مسئلہ ہے بہرحال وہ سب کچھ لکھتا ہے جو جانتا ہے وہ بھی جو نہیں جانتا وہ بھی سمندر خان بھی اسی صف میں شامل ہے سمندر خان نے ایک دن مجھے بتایا کہ جب میں ریڈیو میں نیا نیا آیا تو مجھے انجینئر کے کمرے کے ساتھ کمرہ ملا ادھر میں قلم اٹھاتا ادھر وہ ہتھوڑی اٹھا لیتا اور کھٹ کھٹ کی آوازوں سے میرے خیالات درہم برہم ہو جاتے مجھے انجینئر پر بڑا غصہ آتا بہت سوچتا اس میں اس کا کیا قصور ہے آخر اسے بھی کام کرنا ہے میرا کمرہ اس سے دور ہونا چاہئے تاکہ میں سکون سے لکھ سکوں جب افسران بالا سے کہتا تو وہ جواب دیتے سمندر خان آپ اس طرف توجہ نہ دیا کریں اور کان بند کر کے لکھتے جایا کریں اور میں کان بند کر کے لکھنا شروع کر دیتا مگر کھٹ کھٹ کی آوازیں پھر میرے کان کھول دیتیں اور میں قلم رکھ کے بیٹھ جاتا آخر تنگ آکر اردو کا یہ شعر لکھا اور نیازی صاحب کی میز پر رکھ دیا۔

آباد ہے ادیب کے کانوں میں ورکشاپ
للہ میرے حال پہ فرمائیں رحم آپ

نیازی صاحب یہ شعر پڑھ کے ہنس پڑے اور میرے گلے کو تماشا سمجھ کر سب رقیبوں کو جمع کر لیا سب میرے شعر پر ہنس رہے تھے اور میں ان پر ہنس رہا تھا۔ آخر راشد صاحب (جو اس وقت اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر تھے) کی ادیبانہ رگ پھڑکی اور مجھے اپنے گھر سے لکھ لانے کی اجازت مل گئی ریڈیو کے سلسلے میں سمندر خان کا ایک لطیفہ بھی سن لیجئے پشاور ریڈیو کچہری کے ساتھ ہے آج کل اس کے ارد گرد

اونچی فصیل ہے مگر پہلے لوہے کے تاروں سے حد بندی کی ہوتی تھی وہ کہتے ہیں
کچی وہ کہتے ہیں، عدالت میں جانے والے لوگ ہمیں عجیب نظروں سے دیکھتے تھے
میں ایک دن لان میں نماز پڑھ رہا تھا اتنے میں دو آدمی کچہری کی طرف سے آئے
اور مجھے دیکھ کر ایک نے کہا یہ کوئی نمازی ہے دوسرے نے جواب دیا تو کیا
مراثی نماز نہیں پڑھتے۔

کسی زمانے میں سمندر خان کو پہاڑوں پر چڑھنے کا شوق تھا ریاست
سوات کا کوئی ایسا پہاڑ نہیں جس کے سینے پر سمندر خان کے قدموں کے نشان نہ
ہوں سوات کے سابق والی جہاں زیب سے ان کے دوستانہ تعلقات ہیں سوات
کا قومی ترانہ بھی سمندر خان نے لکھا ہے ایک دن باتوں باتوں میں سمندر خان
نے کہا جہاں زیب کے والد میاں گل تیز چلنے اور پہاڑوں پر چڑھنے میں اپنا ثانی
نہ رکھتے تھے وہ جب سوات کے اونچے پہاڑ کوہ ِ الم پر چڑھتے تو چوٹی پر جا کر دم لیتے ان
کے ہاں اپنے علاقے کے چیدہ چیدہ تیز رفتار جوان ملازم تھے جو شکار کے وقت
ان کے ساتھ رہتے تھے مگر میاں گل ہمیشہ ان سے چار چار فرلانگ آگے رہتے
میاں گل کو جب میرے جنون کا علم ہوا تو انہوں نے ایک دن مجھے پہاڑ پر چڑھنے
کی دعوت دی میں ان کی قیام گاہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ٹھہرا تھا انہوں نے
مجھے پروگرام کے مطابق ٹیلی فون کیا اور خود تیار ہونے لگے ابھی وہ مکمل طور پر تیار نہ
ہونے پائے تھے کہ میں ان کے دروازے پر موجود تھا میری اطلاع پر انہوں نے
نوکر سے پوچھا کیا سمندر خان موٹر سے آیا ہے؟ جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ پیدل
آیا ہے تو مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اس دن ہم اتفاق سے پہاڑ پر
نہ چڑھ سکے جب دوسرے دن اس مہم کا آغاز ہوا تو میاں گل آگے تھے اور میں

پیچھے ادر پھر کچھ اور لوگ ہم دونوں پوری طاقت سے چڑھ رہے تھے اس کشمکش میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ میرا سر ان کے پاؤں سے ٹکرا جاتا تھا چوٹی ابھی کافی دور تھی کہ میاں گل تھک کے بیٹھ گئے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد نیچے اتر آئے بعد ازاں ان کے ملازموں سے معلوم ہوا کہ ہم نے آج پہلی دفعہ میاں گل کو تھک کے بیٹھتے دیکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی معمولی رفتار سے کہیں زیادہ تیزی سے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے تاکہ مجھے پیچھے چھوڑ جائیں مگر ایسا نہ ہو سکا۔

پہاڑوں پر چڑھنا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا جب بھی کوئی کہتا فلاں پہاڑ بہت دشوار گزار ہے تو وہ دوسرے دن اس کی چوٹی پر ہوتے ایک دن اسی جنون میں ایک آدمی کے کہنے پر انہوں نے شام کے وقت ایک پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا ان کا خیال تھا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے وہ اتر آئیں گے مگر چوٹی پر پہنچے تو سورج ڈوب گیا اور وہ راستے سے بھٹک کر جھاڑیوں میں پھنس گئے انہوں نے بیٹھ کے جھاڑیوں کے نیچے سے گزرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے ان کا جسم کانٹوں سے چھلنی ہو گیا کپڑے پھٹ گئے وہ جدھر مڑتے کانٹے ان کی راہ روک لیتے سمندر خان کہتے ہیں کہ میں زندگی میں پہلی دفعہ گھبرایا کیونکہ ریچھ ہمیشہ اس قسم کی جھاڑیوں میں رہتے ہیں جب وہ کافی دیر تک واپس نہ آئے تو جہاں زیب نے چند سپاہی تلاش کرنے کے لئے بھیجے وہ ہاتھوں میں لالٹینیں لے کر اور آوازیں لگاتے ہوئے پہاڑ کی طرف آئے اور بڑی مشکل سے ان تک پہنچے سوات کے مشہور پہاڑ کوہِ الم کے متعلق سمندر خان نے ایک نظم لکھی ہے جو کتابی صورت میں چھپ چکی ہے۔

سمندر خان جوانی میں فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے اب کسی ٹیم کو کھیلتے

دیکھتے ہیں تو ان کا دل فٹ بال کی طرح اچھلنے لگتا ہے ان کے پاس ۱۹۲۷ء کی وہ جرابیں ہیں ابھی تک موجود ہیں جو وہ کھیل میں پہنتے تھے سمندر خان کو اپنی چیزوں سے بے حد محبت ہے ان کے پاس کئی چیزیں اپنے مختلف ادوار کی یادگار کی صورت میں موجود ہیں ان کے پاس کانچ کا ایک خوبصورت گلاس ہے جسے بہت حفاظت سے الماری میں رکھا ہوا ہے اور کبھی کبھی نکال کر استعمال کرتے ہیں یہ گلاس ۱۹۲۱ء سے ان کے پاس ہے اور اس سے اس قدر محبت ہے کہ نوکر پر اعتبار نہیں کرتے خود دھوتے ہیں

سمندر خان بچپن سے شعر کہہ رہے ہیں ان کو اپنے بیاض بے حد عزیز ہیں ایک رات بدرشی میں اچانک طوفان آگیا معلوم نہیں پانی کا ریلا کس طرف سے آیا تھا مگر دیکھتے دیکھتے بدرشی کی گلیاں پانی میں ڈوب گئیں لوگوں نے اپنی قیمتی چیزیں بچانے کی کوشش کی مگر سمندر خان نے گھر والوں کے اصرار کے باوجود تمام سامان چھوڑ کر اپنے بیاضوں کا بستہ دانتوں میں دبالیا اور ایک ہاتھ سے اپنی والدہ اور دوسرے ہاتھ سے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر پانی کو چیرتے ہوئے محفوظ جگہ پر پہنچ گئے۔

سمندر خان پیدل چلتے وقت شعر کہتے ہیں کسی زمانے میں میری بھی یہی عادت تھی اس لئے ان کی دو باتوں کا لطف آگیا آپ نے بتایا کہ ایک دن میں سڑک پر جا رہا تھا کاغذ پنسل میرے ہاتھ میں تھے جب کوئی شعر ہو جاتا تو رک جاتا اور کاغذ پر لکھ کے آگے چل پڑتا ایک آدمی میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا کچھ دقفے کے بعد وہ میرے پاس آکر بولا: خان جو کچھ لکھنا ہے ایک دفعہ لکھ لو بار بار رکنے کیا ضرورت ہے: بس شعر بھول گیا میں نے اس کی طرف غصے سے دیکھا اور وہ

حیران ہو رہے نکل گیا معلوم نہیں وہ کیا سمجھا اس نے دو تین دفعہ پلٹ کر بھی دیکھا جب میں نے بھی اسی قسم کا واقعہ سنایا تو کہنے لگے تم مجھ سے جیت نہیں سکتے میں نے ایک دفعہ وہ بات کی جواب بھی یاد آتی ہے تو ہنس پڑتا ہوں میں شروع سے سیر کرنے کا عادی ہوں ایام جوانی میں جب اپنے گاؤں بدرشی میں تھا۔ تو روز شام کے وقت ساتھ کی پہاڑیوں میں سیر کے لئے جاتا تھا مجھے قدرتی مناظر سے عشق ہے خاص طور پر پہاڑ اور چاندنی رات مجھے بے حد پسند ہیں میری اکثر نظمیں قدرتی مناظر پر ہیں جنہیں اپنی شاعری کا حاصل سمجھتا ہوں سیر کے لئے جانے سے پہلے میں کاغذ پنسل احتیاط سے ٹوپی میں رکھ لیتا ہوں مگر ایک دن بھول گیا جب پہاڑی کے قریب پہنچا تو ایک قطعہ ہو گیا کاغذ پنسل غائب تھے چنانچہ اس خیال سے کہ کہیں یہ قطعہ نہ بھول جائے میں نے پتھر کی ایک سل پر پتھر کے ایک ٹکڑے سے یہ قطعہ لکھا اور وہ سل سر پر رکھ گھر کی طرف چل دیا۔

وہ سیر کرنے کے اب بھی عادی ہیں مگر اب ان کی سیر صدر سے شہر تک محدود ہے وہ روزانہ پیدل شہر جاتے ہیں اور کچھ وقت ادارہ اشاعت سرحد میں ایک دوست کے پاس گزارتے ہیں اور مغرب کی نماز کے بعد واپس آتے ہیں اور جس دن بارش ہو اور وہ کہیں باہر نہ جا سکیں تو صحن میں پھرنے لگتے ہیں یا سیڑھی پر چڑھنے اور اترنے لگتے ہیں۔

سمندر خان کی زندگی کا ہر پہلو سادہ اور تکلف سے پاک ہے لباس صاف ستھرا پہنتے ہیں صاف دلی کا یہ عالم ہے کہ ایک دفعہ پشتو غزل کا ذکر آیا تو کہنے لگے گو میں غزل کہتا ہوں مگر میں در اصل نظم گو ہوں امیر حمزہ شنواری مجھ سے بہت اچھی غزل کہتے ہیں میں ویسی غزل نہیں کہہ سکتا (آج کا شاعر یہ بات نہیں کہے گا۔

میں نے شاعر دیکھے ہیں کہ میر کو بھی خاطر میں نہیں لاتے سمندر خان کی طبیعت بہت سادہ ہے خوراک بھی سادہ ہوتی ہے گاجریں اور گنڈیریاں انہیں بہت پسند ہیں گاجریں گوشت کے ساتھ پکا کر کھاتے ہیں چائے صرف صبح کے وقت پیتے ہیں اور بقول خود جی بھر کے پیتے ہیں ناشتے میں مکھن کی بجائے کریم کھانے کے عادی ہیں دودھ اس لئے نہیں پیتے کہ بچوں کی خوراک ہے سمندر خان ضرورت بغیر کوئی چیز نہیں خریدتے اس لئے وہ کئی بیکار چیزوں سے بچے ہوئے ہیں یہاں تک کہ ریڈیو میں ملازم ہونے کے باوجود ان کے پاس ریڈیو نہیں ہے اپنا سارا کام خود کرتے ہیں صرف نوکر کھانا پکاتا ہے ایک دفعہ ان کی طبیعت ناساز اور نوکر چھٹی پر تھا جب میں گیا تو وہ توس سینک رہے تھے مجھے بڑی مشکل سے یہ خدمت کرنے کی اجازت دی تھی ان میں یہ عادت تھی کہ جب تک بستر کے چاروں کونے برابر نہ ہوں انہیں نیند نہیں آتی تھی وہ گھنٹوں چادر درست کرتے رہتے تھے ظاہر ہے کہ یہ نوکر کے بس کی بات نہیں تھی وہ بے ترتیبی کو بالکل پسند نہیں کرتے ان کی ہر چیز ترتیب سے رکھی ہوتی ہے جو چیز جس جگہ سے اٹھاتے ہیں پھر وہیں رکھ دیتے ہیں اور دوسرے سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں ورنہ برا مانتے ہیں سمندر خان ارادے کے بہت پکے ہیں وہ جب کسی بات کا تہیہ کر لیتے ہیں تو پھر پیچھے نہیں ہٹتے خواہ اس میں ان کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے کچھ دانت دکھنے لگے تھے تو سارے دانت نکلوانے کا فیصلہ کر لیا ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود سارے دانت نکلوا کر دم لیا دانت نکلوانے کے بعد کھانے کا مقصد صرف پیٹ بھرنا ہوتا ہے جو جس طرح کھا سکتا ہے کھاتا ہے سمندر خان نے یہ مرحلہ بھی بڑی مشکل سے طے کیا ہے ایک دن کہنے لگے میری حرکات کو غور سے دیکھا کرو کیونکہ تم بھی ایک دن اسی منزل سے

گزر و گے میں نے کہا اس منزل کا آغاز تو ہو گیا ہے مگر میں آپ کی طرح ارادے کا پکا نہیں اس پر خوب ہنسے۔

سمندر خان بہت خوددار ہیں اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرتے کچھ دن ہیں آٹے کی قلت ہو گئی تھی جب مجھے ان کے نوکر سے معلوم ہوا تو کسی ذریعے سے کچھ آٹا لے کر ان کے نوکر کو دے آیا وہ اس پر خوش تو ہوئے مگر مجھے آٹے کی قیمت ادا کر کے انہیں چین آیا اسی دن میں کچھ مال لٹ لے گیا کہنے لگے آئندہ اس طرح نہ کرنا میں تمہاری خدمت کسی لالچ کے بغیر کر رہا ہوں سمندر خان کا غصہ بھی مشہور ہے پہلے میں یقین نہ کرتا تھا مگر جب بقول فانی

نبضِ کائنات ڈوبتی نظر آئی تو محتاط ہو گیا۔

میں سمندر خان کے فن کے بارے میں کچھ نہیں لکھ سکتا کیونکہ پشتو پڑھنے کا سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا تھا ۱۹۵۳ء میں ملازمت سے علیحدہ ہو گیا اور کوشش کے باوجود پشاور نہ جا سکا بہر حال ان کے بیاض دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس دور میں شاید ہی کسی شاعر نے اتنی عرق ریزی کی ہو غالبؔ ان کی دو کتابیں چھپی ہیں اور باقی سارا سرمایہ کسی قدر شناس کا انتظار کر رہا ہے۔

★ ★



بے نام مُسافت کی ایک مُسافر

منیر احمد شیخ

جمیلہ شاہین نے مجھے تبلایا کہ افسانوں کی ایک تازہ کتاب بازار میں آئی ہے، آپ نے نہیں دیکھی؟ میں نے پوچھا کونسی؟ تو اس نے کتاب میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "یہ دیکھئے" کتاب کا نام "بے نام مسافت" تھا اور نیچے کشور ناہید لکھا ہوا تھا۔ میں نے تعجب سے جمیلہ کی طرف دیکھا تو اُس نے کہا:

"ہاں ہاں۔ افسانے۔ غزل تو بکھری ہوئی شئے ہوتی ہے مگر نظم بلکہ ہر نظم ایک کہانی ہوتی ہے۔ ایک اکائی۔ اور میں نے تو اِس کتاب کو اسی نظر سے دیکھا ہے۔ آپ بھی دیکھیں۔ اور افسانوں کی کتاب پہ مضمون کسی افسانہ نگار کو ہی لکھنا چاہیئے۔ نقادوں اور سیاست دانوں سے مجھے اب ویسے بھی سخت الرجی (ALLERGY) ہو گئی ہے۔"

میں نے کتاب کو دیکھا۔ ایک مرتبہ۔ دو مرتبہ۔ اور دو ہفتوں میں بار بار پڑھنے کے بعد بھی میں اپنے آپ کو قائل نہ کر سکا کہ مجھے اس کتاب پر کچھ کہنے کا حق ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ کشور ناہید شاعرہ ہے اور میں لوہے پیتل کا کاروبار کرتا ہوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کام میں نے کب سے شروع کیا اور پھر یہ کہ لوہے پیتل والوں کو تو اپنی ٹھک ٹھک سے غرض رکھنی چاہیئے شاعری میں منہ کیوں ماریں؟ لوہے پیتل کے معمے کو میں یوں حل کرتا ہوں کہ آپ ایک واقعہ سُن لیجئے۔

موسیقی سننے کا ٹھرک میرے ساتھ مدت سے لگا ہوا ہے۔ ایک معمولی سے خانصاحب کے گھر ان کی بیٹھک میں گانا سننے کی خرمائش لے کر حاضر ہوا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے سنگت کے لئے طبلچی تو موجود ہے مگر کوئی باجہ والا پاس نہیں ہے۔ گھر کے قریب ہی بینڈ والوں کا چوبارہ تھا۔ بھاگے بھاگے گئے اور براتوں میں منہ سے باجہ بجانے والے ایک مفلوک الحال شخص کو پکڑ لائے۔ اُس نے باجے پہ انگلیاں رکھیں۔ پھر اُسے طبلے کے ساتھ ملایا اور خاں صاحب نے گانا شروع کر دیا۔ ایک مشکل تان انہوں نے اٹھائی تو باجے والے نے بھی اس تان کو فوراً پکڑا اور باجے سے نکال کے دکھائی۔ خاں صاحب رُک گئے اور بے اختیار باجے والے کو داد دی۔ باجے والے نے بڑی لجاجت سے باجہ زمین پر پھینک دیا اور خاں صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کہنے لگا "خان صاحب! ذرہ نوازی ہے۔ گانا تو آپ گاتے ہیں، ہم تو لوہے پتیل کا کام کرنے والے ہیں"۔ قصہ یہ ہے کہ شاعری میں بھی گانے والا ہمیشہ شاعر ہی ہوتا ہے اور نثر نگار کسبی۔ اس کسب میں وہ لگا رہے تو کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے اور اُس کے اس کسب میں بھی ایک اپنا حسن پیدا ہو جاتا ہے مگر وہ باتیں جو الہامی کیفیت میں آہنگ کے ساتھ اترتی ہیں، اور وہ جو ستاروں کے درمیان ربط کا ایک سلسلہ ہے اور وہ جو ہم عام دنیا دار سننے کی سکت نہیں رکھتے اور اگر کبھی سُن بھی پاتے ہیں تو کہنے کا یارا نہیں رکھتے ــــــ یہ سب شاعر کا حصہ ہیں۔ وہ خبر کے مقام پہ پہنچ کر لوٹتا ہے اور دوسروں کو اس مقام کی جھلک بھی دکھاتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ صوفی بھی ہے۔ مگر ایسا خود غرض صوفی نہیں جو سب کچھ اپنی ذات تک ہی محدود رکھتا ہے اور جس سے کوئی فیضان حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ کہ شاعری پہ لکھنا اور وہ بھی ایک آدھ ہفتہ کتاب دیکھ کر،

میرے لئے اِس لئے بھی ایک مسئلہ ہے کہ شعر کے بارے میں مجھ سے اُس وقت تک کوئی بات نہیں ہو پاتی جب تک کہ وہ میرے بدن اور روح دونوں میں رچ بس نہ جائے۔ اچھے شعر کی کیفیت اُس نشے کی سی تو ہونی چاہئیے جو کچھ دیر کے لئے آپ کو زندہ رہنے کی عام سطح سے بلند کرے جائے۔ اِسے شراب کہہ لیجئے' ایل۔ ایس۔ ڈی کہہ لیجئے' یا جسمانی لمس کی روح پرور کیفیت' بہر حال کچھ نہ کچھ تو اپنے ساتھ بیتنا چاہیے وگرنہ دو مصرعے وزن میں جوڑنے کا کام تو صبح سے شام تک ہوتا ہی رہتا ہے۔ شاعری کا قصہ یہ ہے کہ ایک شعر سلیس زبان میں سمجھ نہ آنے کے باوجود بھی محسوسات کی سطح پر اپنا کام کر جاتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ ہم اسی بات کے پیچھے پڑ جائیں کہ شعر یا فن کو عقلی و ذہنی سطح پر سمجھنا ضروری ہے اور تب کہیں جا کر وہ بامعنی بنتا ہے۔ شاید ہم بھول جاتے ہیں کہ فنون میں معانی کی کبھی ایک سطح نہیں ہوتی۔ شعر' تصویر اور سُر کے کئی پردے ہوتے ہیں۔ وہ جتنا ظاہر کرتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ چھپاتے ہیں۔ یہ تو لکھنے والے اور پڑھنے والے کی حس پر مبنی ہوتا ہے کہ اُس نے اِس کو کس قدر تہذیب یافتہ بنایا ہے۔ ورنہ غالب کا شعر اب بھی ہزاروں لاکھوں کی سمجھ میں نہیں آتا اور عبدالحمید عدم اور رئیس امروہوی اتنے بامعنی اور سہل ہیں کہ عوام کو انہیں شاعر تسلیم کرنے میں کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا اور قبولِ عام کی سند اُن کے پاس ہے۔ یہ بات مجھے اس لئے کہنا پڑی کہ ہمارے تہذیبی ورثے میں جس میں کہ ہمارے عقائد اور ایمان بھی شامل ہے ہم تجرید کے وارث ہیں۔ خُدا کا تصور ہمارے یہاں ہمیشہ سے تجریدی شکل میں قبول کیا گیا ہے۔ خُدا اور شاعری دونوں کو سمجھنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے انہیں محسوس کرنا' اِن کے مختلف روپ سے اِن کی نشاندہی کرنا اور ان کے راستے سے ذات سے کائنات تک پہنچنا وجدانی اور حسّی خصوصیات سے ہی ممکن ہے جو عقل سے میلوں آگے کی خبر دیتی ہیں۔ لہٰذا "بے نام مسافت" کی ادبی و فنی خوبیوں پر محاکمے پیش کرنے کی بجائے میری کوشش یہ تھی کہ کشور ناہید کے شعر میں' مَیں بھی کچھ دیر اُس کے ساتھ چلوں اور اُس کی روحانی

و باطنی واردات میں خود کو اور کائنات کو دیکھوں مگر مجھے معذرت سے یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ جس سفر کو کشور نے نہ جانے کتنے طویل عرصے میں اور رت جگوں کے ساتھ طے کیا ہے، میں آنکھ جھپکنے میں اِس مسافت کا کوئی بھرپور روپ آپ کو دکھا سکوں گا۔ اس معذرت کے باوجود بھی دو چار روشن نقطے جو مجھے جلدی میں نظر آئے آپ کے دکھانے کو لے آیا ہوں۔ مگر یہ بس اتنا ہی ہے۔ اِس لئے کہ میں کشور ناہید اور پھر آپ سے معذرت خواہ ہوں اور شرمندہ بھی مگر یہ معذرت اور شرمندگی "محمد نقوش" کی اُس معذرت اور شرمندگی سے ذرا مختلف ہے جب کہ وہ اپنے تئیں لکھنے کے فن سے نابلد ہونے اور ادیب نہ ہو سکنے کی شرمندگی کے باوجود تین چار کتابیں لکھ گئے ہیں۔ میں اگر معذرت خواہ ہوں تو اس لئے کہ میرے مزاج کے مطابق مجھے اِس کتاب کو اس طرح پڑھنے کا اتنا وقت نہ مل سکا کہ میں جواُن لذتوں، کیفیتوں اور دُکھوں کو پوری طرح دیکھ سکتا اور پھر بقدرِ ظرف و ہمت آپ سے بھی کچھ کہہ سکتا۔

بہر حال سب سے پہلے تو مجھے یہ محسوس ہُوا کہ "بے نام مسافت" کی مصنّف میری ایک بے نام دوست ہے اور ہماری ذہنی رفاقت اُس تنہائی کے احساس کی وجہ سے ہے جو اس رستی بستی دُنیا میں بہت کچھ حاصل ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ ایک تشنگی، ایک بے کلی، ایک تذبذب، ایک جذبۂ نامکمل کراماً کاتبین کی طرح ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ آپ کی ذہنی دوستی سے "پبلک" کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے یا ادب میں کس نئی جہت کا اضافہ ہو سکتا ہے؟ تو میں یہ کہوں گا کہ میرے ساتھ کشور ناہید اُسی فلسفے پر ایمان رکھتی ہے کہ ادب ذات اور ذاتی رشتوں کے حوالے ہی سے تخلیق ہوتا ہے۔ ذاتی حوالے کے بغیر ادب ایک کھوکھلا اور خلائی عمل ہے جس میں انسانی تجربے کی گھمبیرتا اور انسانی زندگی کی کوئی تڑپ نہیں۔ کشور اپنی کتاب کے ابتدائیے میں کہتی ہے کہ "ذاتی واردات کا غیر ذاتی انداز میں اظہار کا مسلک بھی کچھ اتنا نہ بھایا۔ اِسی مزے کی تلاش رہی کہ ذاتی واردات کا معرضِ اظہار بھی ذاتی ہو۔ انسان کی

انسان سے لوٹ کھسوٹ کی دنیا میں خواب اور بشارتیں مسخ ہو جاتی ہیں انہیں واگذار کرنے کی سعی کو شعر سے جدا نہیں رکھا جا سکتا ہے"۔ یہ نہ تو کوئی کلیہ ہے اور نہ فارمولا بلکہ زندہ تخلیقی عمل کا راستہ ہے کہ جو فن کار کو ذات اور کائنات کے باہمی رشتے کی گتھیوں کو سلجھانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ کشور ناہید کے سلسلے میں سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ اس نے شاعری کو ذاتی اظہار کا ذریعہ مانتے ہوئے بھی اسے محض معروضی (SUBJECTIVE) حد بندیوں کے اندر تانے لگا کے نہیں رکھا اور نہ ہی اسے کوئی ایسا معمہ بنایا جو ہمارے یہاں فیشن کے طور پر علامتی ادب اور علامتی شاعری کہلاتی ہے۔ اس نے اپنی ذات کے پردوں کو جس انداز سے کھولا ہے ان پردوں کے پیچھے وہ معاشرہ اور وہ جہان بھی نظر آتا ہے کہ جس میں کشور ناہید نے آنکھ کھولی اور اس کی رنگا رنگی کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ یہ رنگ اس کی شاعری میں کہیں جذبوں کا پرتو ہیں تو کبھی قوس و قزح کا وہ نیم دائرہ جو کائنات پر محیط ہو کر زمین سے فلک تک فضا کو رنگوں سے بھر دیتا ہے اور کائنات کے ماتھے کا جھومر بن کر چمکتا ہے۔ ایک ذاتی حوالے کی بات سنیئے کئی برس پہلے میں نے کشور ناہید کو وائی ایم سی کی سیڑھیوں پر پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کے سر پر اوڑھنی تھی مگر اس کے چہرے کا رنگ زرد زرد تھا۔ وہ مجھے عام لڑکیوں سے مختلف سی لگی۔ بے پرواہ سے زیادہ لاپرواہ، چہرے اور گفتگو دونوں میں نہ کوئی غازہ نہ بناوٹ۔ پھر جب اس نے حلقے میں غزل پڑھی تو نہ صرف یہ کہ اس کے چہرے کے زرد رنگ میں اوڑھنی کا رنگ بھی کچھ زرد نظر آیا بلکہ اس کی آواز، لہجہ اور خیال سبھی اس لحاظ سے مختلف تھے کہ وہ مجھے اپنے گھٹے ہوئے معاشرے میں ایک ایسی آواز لگی جو صدیوں کی گھٹن کو اس طرح کاٹتی ہے جس طرح کہ صبح کے سورج کی پہلی کرن تاریکی کو قینچی کی طرح کاٹتی ہیں۔ اس میں بے باکی تھی، جو ہمارے لئے حیرت کی بات تھی، اس میں جرأت تھی جو ہم نے صرف مردوں کے لئے مخصوص کر رکھی ہے، اس میں حقیقتوں کا برملا اور کھلا اعلان تھا جو ہمارے جذبۂ منافقت پر ایک بہت بڑی زد تھی۔ ہمارے ہاں جذبات کے

اظہار کی اجارہ داری صرف مردوں کی تھی یہ بات میں صرف اُردو شاعری کے پس منظر میں کہہ رہا ہوں۔ پنجابی شاعری میں معاملہ ہمیشہ اس کے برعکس رہا۔ ہیر کے کردار ہی کو دیکھ لیجئے۔ سارے قصے میں ہیر رانجھے سے زیادہ فعال ہے اور عشق کے اظہار میں جو بے باکی طمطراق اور ہمت اُس میں ہے، رانجھا اُس کے سامنے ایک (PASSIVE) کردار نظر آتا ہے۔ رانجھا ہیر کے سامنے دبا ہُوا ہے۔ جذبے اور ہمت کی وجاہت کا سمبل ہیر ہے رانجھا نہیں۔ اس لئے کہ ہیر گھٹے ہوئے معاشرے کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ وہ روایت اور شریعت سب کو ایک طرف رکھ کے سچے اور کھرے عشق کا پرچم بلند کرتی ہے۔ لوگوں کو حیرت زدہ کرتی ہے۔ بندھی ٹکی اور مروجہ روایات کے پرستاروں کو وہ صدمۂ عظیم پہنچاتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی احتجاج نے اُسے آج تک زندہ رکھا ہُوا ہے کشور ناہید ہیر کی سی جند جان نہ رکھنے کے باوجود ہیر کا جذبہ اور روح رکھتی ہے۔ اِس کا اظہار اُس نے اپنی شاعری میں کیا۔ بے باکی، جرأت اور ہمت کی یہ پہلی آواز تھی اور اسی آواز کا گونجتا ہُوا آہنگ اب فہمیدہ ریاض کی نظموں میں سنائی دیتا ہے۔

"بے نام مسافت" میں کشور ناہید فنی بلوغ کے اُس مقام کے اب قریب قریب نظر آتی ہے جہاں شاعر لفظوں کو اپنی سرکار میں یوں لے آنے پر قادر ہو جاتا ہے کہ وہ ان سے جس طرح چاہے کھیلے اور اُن کے اجسام کو توڑ موڑ کے اُن کی شکلیں بدلے اور پھر اُن سے نئے استعارے اور تلازمے وضع کرتا چلا جائے۔ خدانخواستہ یہ لفظوں کی توہین نہیں۔ لفظ تو لکھنے والے کا ہتھیار ہے مگر ہتھیار کا وقار اُس وقت بڑھ جاتا ہے جب وہ کسی چابکدست اور ماہر فن کے ہاتھوں میں ہو۔ کشور ناہید نے نظموں میں لفظوں کے جوڑ اور تال میل سے ایسی ایسی نئی تراکیب ایجاد کی ہیں کہ لفظوں کے ایک سے زیادہ روپ دکھائی دیتے ہیں۔ میرے نزدیک شاعر کی یہ مہارت اور قدرت اس کی پختگی کی دلیل ہے کہ وہ اپنی زبان خود وضع کرنے پر قادر ہو جائے اور یہ نئی زبان پھر ایک نیا لہجہ بھی وضع کرتی ہے اور نیا لہجہ ایک نئے شائل

کو جنم دیتا ہے اور نیا سٹائل فن میں ایک نئی شخصیت کا اضافہ کرتا ہے۔ ان تراکیب کی ساخت میں مجھے میراجی، راشد اور مختار صدیقی جگہ جگہ نظر آتے ہیں مگر کشور نے ان شعرا کے تکنیکی تجربوں کو اس طرح اپنایا ہے کہ وہ ان کی بازگشت معلوم نہیں ہوتی، بلکہ اُس نے ماضی کے شعری تجربوں کو اپنی جھولی میں یوں سمیٹا ہے جیسے نیا دن، گذرے ہوئے دن کو سمیٹتا ہے۔ کل اور آج میں جو تمیز ہے وہی کشور کی اِن تازہ نظموں میں بھی موجود ہے۔

اب رہا سوال اکائی، وحدت اور افسانہ نگاری کا۔ جمیلہ شاہین تو یہ کہتی ہے کہ نظم اپنی جگہ ایک مکمل کہانی ہوتی ہے۔ مجھے اِس سے کوئی اختلاف نہیں مگر "بے نام مسافت" طے کرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ پورا سفر ایک ہی کہانی ہے۔ خدا کے لئے یہ نہ پوچھئے گا کہ اس کا پلاٹ کیا ہے، آغاز اور انجام کیا ہے اس لئے کہ میرے لئے تو ایک آنسو بھی افسانہ ہے، پہلا سفید بال بھی افسانہ ہے، خزاں کا گیت اور شکستِ رنگ بھی افسانے ہیں۔ کشور ناہید بھی ایک ایسی ہی افسانہ نگار شاعرہ ہے جسے دُلہن بننے کا بڑا چاؤ تھا مگر جب وہ ایسی سمٹی سمٹائی گٹھڑی بنی ہوئی دُلہن نہ بن سکی تو اُس نے اس محرومی پر جو کہانی لکھی اُس کے دو اقتباس سُن لیجئے:

میں نے تنہا، سینکڑوں راتیں گذاریں
جاگ کر یہ سوچتے
کس طرح ہو گی بھلا
اُس وصل کی شب کی سحر
جس شب کی آنکھوں کی چھُبن
نیند کی خوشبو کی باہنوں سے لپٹ کر سو رہے۔
میں نے بچپن ہی سے پوچھا تھا

دُلہن کا عکس و رنگ
جامنی رخسار کی رنگت
مہک، اُبٹن کا لمس
شعلہ رو، شعلہ نفس
سمٹی سمٹائی سی
گٹھڑی کی طرح بیٹھی ہوئی

میں نا دلہن ایسی بنی لیکن
کہ مہندی تھی نہ افشاں
اور نہ اُبٹن کا خمار
آنکھ میں کاجل کی تحریریں بھی
اپنوں سے جدائی کے غموں میں ڈھل گئیں
رہ گئی اُس قرب کی خوشبو کہ جس کے نام پر
خون کے رشتوں کو بھی
میں زندگی سمجھی نہیں
اور بچہ خوشبو سے رشتہ تا بکے!
خواب کی مانند جینا تا بکے!

"خوشبو سے رشتہ تا بکے" اور "خواب کی مانند جینا تا بکے" یہی اس داستان کی تمہید ہے اور یہی اس کا انجام اور ایسے ہی محرومی، تنہائی اور دُکھوں کے نازک احساسات سے ساری کتاب کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ جو الگ الگ نظم۔ کا دوں۔ کشور ناہید کی

نظموں کے حوالوں کے معاملے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ کوئی نظم بھی توڑ کر پیش نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ یہ نظم ایک ایسی زبردست اکائی ہے کہ ایک آدھ مصرعہ بھی نکال دیں تو وحدتِ تاثر مجروح ہوتی ہے۔ ایک مختصر سی نظم کا مکمل حوالہ دینے کی کوشش کرتا ہوں اس نظم کا عنوان ہے "اثبات"۔ اِس نظم میں احساس کے ایسے نازک آبگینے کو دکھایا ہے کہ نظم پڑھ جانے کے بعد آدمی کھوسا جاتا ہے جیسے اُس کے ساتھ کچھ بیت گیا ہو۔ اب کیا بیتا ہے۔ یہ تو میں بتلا نہ سکوں گا اور نہ ہی شاید کشور ناہید۔ مگر آپ نظم ملاحظہ کیجئے:

میرے ویرانۂ تن میں جاگا
زیست کا کامنی احساس
تُنبک سارئ ساحل کا فسوں
اور بے پایاں اُمڈتی ہوئی لہروں کا زبوں
مجھ سے پوچھا مرے ہر انگ نے
اب تو بولو!
کیا تمہیں پھول کے کھِلنے کا سبب ہے معلوم
میں ہنسی
اور مچی صحن میں دھوم

پھر کئی ایسی نظمیں ہیں جہاں وہ ذاتی حوالے سے اپنے زمانے اور عہد سے رشتہ جوڑ کے دکھلاتی ہے اور حقیقتوں کو اس طور پہ بیان کرتی ہے کہ ماضی وحال کے ساتھ آنے والے زمانے کا ادراک بھی ہونے لگتا ہے۔ اُن کی نظم "آگہی" میں اس ادراک کا اظہار ملاحظہ فرمایئے۔ حرف دو بند نقل کر رہا ہوں۔

ہماری ماں نے ہمیشہ روٹی پکائی ایسے

کہ ایک تھاپ ہٹ میں تو اِک
گود میں ہمکتا
مگر نہ حرفِ گراں کبھی اُس کے لب پہ آیا

میں آپ ماں ہوں
مگر مرے لختِ جاں کو
آیا کی گود کی گرمیوں نے پالا
مجھے تو آرام ہے، کہ ہر روز مُنہ اندھیرے
وہ سامنے والی بیکری سے
منگالوں میں ناشتہ جو چاہوں
پلک جھپکنے میں، جا کے بازار سے خرید دوں
جو چیز چاہوں
مجھے خبر ہے
اگر یونہی میری جاں کی صورت
مری کمر بھی جھکی تو کوئی نہ ساتھ دے گا
نہ ماں کے مزار پر فاتحہ پڑھے گا
غرض کہ بندھن میں سارے رشتے
نہ ماں نہ دُلار کچھ ہے
نہ تیرا میرا ہی پیار کچھ ہے
خارج سے رشتے کا یہ ادراک جیسا کہ میں نے کہا ہے ان کی بہت سی نظموں

میں ملتا ہے مگر اُس نے اپنے ارد گرد کی گدلائی ہوئی سیاسی اور معاشرتی فضا کو بھی شاعری ہی میں پیش کیا ہے، سیاسی نظمیں یا قومی ترانے نہیں بنائے

"عکس نما" میں ہم اپنی صورت یوں دیکھتے ہیں:

اب تو فرخندہ جفا کار ہیں ہم
اب تو پڑھ لیتے ہیں ہر سادہ ورق کی تحریر
اب نہیں کرتے وفا کی تقصیر
اب ہر اک شخص سے ملتے ہیں بدل کر شکلیں
اپنے قابو میں ہیں اب فتنۂ شب کی سوچیں
اب ہمیں خوفِ ہلاکت بھی نہیں
اب کوئی آئینہ، معیارِ عدالت بھی نہیں

اور پھر احتجاج کا یہ انداز بھی ذرا دیکھئے:—

جب تمنّا صدفِ غم میں ہی محصور رہے
جب مقدر شب دیجور رہے
جب کہ دیوانے نہ اُلجھیں کبھی زنجیروں سے
شہر طوفان کی زد میں ہوگا

یہ ہیں اُس شعور و آگہی کی چند مثالیں جو فن کار کی ذات اور اُس کے ماحول کے باہمی رشتے سے وجود میں آتی ہے۔ ان میں وہ سب کچھ ہے جو حال میں ہمارے سامنے ہے یا پھر ماضی میں ہمارے مقدّر کا حصّہ بنا رہا ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ اُس نے اپنے آئینہ خانہ میں وہ سارے عکس اُتار لئے ہیں جو ذات کے دکھوں سے کائنات کے غموں تک پھیلے ہوتے ہیں۔ اُسے ابھی لمبا سفر طے کرنا ہے۔ ایک دو کتابوں

کی مصنف بن جانے کے بعد اُسے شہرت، عزت، پراپیگنڈہ، ناموری اور نمائش کے جنات سے اپنے آپ کو یونہی بچانا اور محفوظ کرنا ہوگا جس طرح کہ عصمت کی حفاظت کی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں، بالخصوص جدید دور میں، شاعر اور ادیب جلد ہی بانجھ ہو کر آخر خلیفے کیوں بن جاتے ہیں؟ ایک تو ہمارا ماحول بہت محدود ہے، ماحول سے میری مراد ادب پڑھنے والوں کا طبقہ ہے اور دوسرے یہ کہ ادیب اور شاعر کو ہمارے معاشرے میں اتنا محروم رکھا جاتا ہے کہ اس کی ذات اور فن دونوں اس محرومی سے منفی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ ان محرومیوں سے جسمانی و جذباتی کمزوریاں در آتی ہیں جو نہ تو شخصیت اور نہ ہی فن کو مکمل ہونے دیتی ہیں۔ لیکن محرومیاں اور زمانے کا زہر اُسی وقت تخلیق کے سانچے میں ڈھلتا ہے جب محض ذہنی انتشار پیدا کرنے کی بجائے ایک ایسی گہری ذاتی واردات میں بدل جائے کہ وہ واردات ذاتی بھی ہو اور دوسرا بھی اُس میں اپنے آپ کو شریک پائے۔

"بے نام مسافت" سے یہ میری ایک مختصر ملاقات تھی جو سرراہے گاہے میں نے آپ سے بیان کر دی۔ کشور ناہید سے اس سے بہتر ملاقات کی شاید کوئی اور صورت بھی نہ تھی۔ ویسے بھی گانا جس طرح محض کان سے ہی سننا چاہیے اور گانے والے کو درمیان میں لا کر گانے کے تاثر کو مجروح نہیں کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ فن اور فنکار کے سلسلے میں بھی ذاتی رشتہ وہی ہے جو اُس کی تخلیق سے ہو جس میں کہ ہم سب اپنا عکس دیکھتے ہیں اور اپنے آپ کو پہچانتے بھی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ فنی اظہار میں جو شخصیت اُبھرتی ہے وہ اُس شخصیت سے کوسوں دور ہوتی ہے جو زندگی کے کاروبار میں نظر آتی ہے۔ کئی ایسے شاعر ابھی تک بقید حیات ہیں جو کلام میں تو صلیبیں اٹھائے ہوئے، بغاوت کرتے ہوئے، آزادی اور امن کا پرچار کرتے ہوئے اور اعلیٰ انسانی قدروں کا پرچم اٹھائے سنہری رنگ آنکھوں میں بکھیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر ان کی عملی زندگیاں ہمارے

سب کے سامنے ہیں جہاں وہ مصلحت اور سودے بازی سے ہر وہ کام کر لیتے ہیں جو میرے اور آپ کے لئے انہوں نے حرام یا مکروہ قرار دے رکھا ہے۔ یہ بات اس لئے کہنا پڑی کہ جب تک کشور ناہید کے دُکھ کی زرد اوڑھنی اُس کے کلام کے ساتھ اُس کے سر پہ بھی نظر آتی رہی تو میں سمجھوں گا کہ اُس کی اور اُس کے فن کی سنگت قائم ہے اور اُس کی اپنی ذات اُس کی شاعری میں مزاحمت کا باعث نہیں اور خُدا اس دن سے اُسے بچائے کہ جب میں اُس کا کلام پڑھوں اور اُس میں اپنی ذات ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے اُس کی ذات کا نشان بھی نہ پاؤں تو میرے لئے اس کی شاعری بے معنی ہو کر رہ جائے

آخر میں ایک بات اِس مجموعے کی آخری نظم کے بارے میں کہتا چلوں جس کا عنوان "یوسف کامران" ہے۔ اس نظم کے بارے میں پہلے بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ یوسف کامران جو اس نظم کا موضوع ہے اتفاق سے وہ کشور ناہید کا شوہر بھی ہے۔ ممکن ہے میں غلط ہی سمجھ رہا ہوں مگر نظم والا یوسف کامران شاعر کی محبوبہ کی صورت میں اُجاگر ہوتا ہے وہی ہیر اور رانجھے والی بات۔ مگر فی الحال اس پر اس سے کچھ زیادہ کہنا مجھے اس لئے مشکل دکھائی دے رہا ہے کہ یہ اتنی ذاتی بات ہو جائے گی کہ شاید اچھے بھلے سکہ بند نقاد بھی اِس ذاتی رشتے میں کوئی کائناتی عنصر نہ دیکھ سکیں۔ یہ نظم مجھے بہت اچھی لگی تھی، دیگر خوبیوں کے علاوہ اس لئے بھی کہ اس میں بھی کشور کی محبت کا اظہار جس بلند آہنگ سے ہوا ہے، خدا کرے کہ یہ آہنگ اس کے اظہار کی جرأت ہماری مشرقی لڑکیوں میں پیدا ہو جائے اور کم از کم وہ مردم شماری میں اپنے شوہر کا نام تو اعتماد سے لکھوا سکیں۔



آوازِ دوست

نظیر صدّیقی

ممتاز مسعود اردو کے ان خوش نصیب ادیبوں میں سے ہیں جن کی تاریخ نہ صرف شہرت سے شروع ہوتی ہے بلکہ مقبولیت سے بھی۔ شہرت تو ان لوگوں کو بھی مل جاتی ہے جو زمانے کو صرف چونکانا جانتے ہیں۔ مقبولیت صرف ان لوگوں کو میسّر آتی ہے جو زمانے کو متاثر اور مسحور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ قدرت نے مختار مسعود کو اس طرح کی صلاحیت سے جتنی فیاضی کے ساتھ نوازا ہے وہ اس کے استعمال میں اتنے ہی بخل سے کام لیتے رہے ہیں۔ ویسے اس بات کا امکان واضح ہے کہ ان کے اس بخل میں ان کی مرضی سے زیادہ ان کی منصبی مجبوریوں کو دخل رہا ہوگا۔ ان کی تمام منصبی فتوحات کے باوجود میں یہ شاید سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ اگر وہ کسی صحیح اور صحت مند معاشرے کے فرد ہوتے تو صرف ان ذہنی اور تخلیقی کاموں کے لئے وقف ہو کر رہ گئے ہوتے جن کے لئے ان کا موجودہ منصب انہیں کم سے کم وقت دیا کرتا ہے۔

مجھے اب تک کوئی باذوق آدمی ایسا نہ ملا جو مختار مسعود کا صرف ایک مضمون دیکھ کر خواہ وہ مضمون کوئی بھی ہو ان سے متاثر اور ان کا معتقد

نہ ہو گیا ہو۔ ایسے لوگوں کی فہرست میں خود میرا نام بھی رکھا جا سکتا ہے
آج سے چند سال پہلے جب میں نے پاکستان کے ایک خوبصورت مگر غیر ادبی رسالہ "کاریگر" میں ان کا ایک مختصر سا مضمون دیکھا تو یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ ان کی ذات میں ایک غیر معمولی انشاء پرداز چھپا بیٹھا ہے پھر جب مجھے "نقوش" میں ان کا مضمون "مینار پاکستان" پڑھنے کا اتفاق ہوا تو اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی کہ میرا اندازہ حرف بحرف صحیح تھا۔ معلوم نہیں انہوں نے لکھنے کی ابتدا کب اور کس طرح کی تھی۔ لیکن جب وہ اردو ادب کے اسٹیج پر آئے تو آتے ہی پڑھنے والوں کے ذہن پر چھا گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مینارِ پاکستان جیسا مضمون نہ صرف بڑے بڑوں سے خراج تحسین وصول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ اپنے خالق کو غیر فانی بنا دینے کا امکان بھی۔

شعر وادب میں تخلیقات کی مقدار بھی اپنی اہمیت رکھتی ہے لیکن بعض اوقات کمیت کی تلافی صرف کیفیت سے ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعر وادب کی کوئی تاریخ ایسے لوگوں کے ذکر سے خالی نہیں ملتی جو صرف ایک مصرع یا صرف ایک شعر یا صرف ایک مضمون یا صرف ایک ناول کی بدولت شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں داخل ہو گئے۔ مجھے ممتاز مسعود کا مضمون "مینارِ پاکستان" یا ان کی پہلی تصنیف "آواز دوست" اسی پائے کا تخلیقی کارنامہ معلوم ہوتی ہے۔

"آواز دوست" صرف دو مضامین (۱) مینارِ پاکستان اور (۲) قحط الرجال کا مجموعہ ہے۔ اگر اس کتاب کی تمام صوری اور معنوی خوبیوں کو ایک فقرے میں

سمیٹنے کی کوشش کی جائے تو مہدی افادی کے الفاظ میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ یہ کتاب عروس جمیل و لباس حریر، کے بہترین نمونوں میں سے ہے۔ مختار مسعود کی نفاست مزاج اور لطافت طبع جوان کی زندگی کے ہر شعبے میں جلوہ گر ہے۔ کتاب کی کتابت و طباعت سے لیکر اس کے سرورق اور جلد بندی تک میں کارفرما نظر آتی ہے۔ کتاب کی قیمت دس روپے رکھی گئی ہے جو میرے ایسے بے مایہ لوگوں کے لئے یقیناً زیادہ ہے لیکن کتاب کی قدر و قیمت کے مقابلے میں یہ قیمت کچھ بھی نہیں۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ "آواز دوست" دو مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن کے موضوعات بظاہر ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں لیکن جن کے باہمی تعلق کو مصنف نے اپنے دیباچے میں جو غالباً اردو ادب میں مختصر ترین دیباچہ ہے یوں ظاہر کیا ہے :-

"اس کتاب میں صرف دو مضمون ہیں
ایک طویل مختصر۔ اور دوسرا طویل تر۔ ان دونوں
مضامین میں فکر اور خون کا رشتہ ہے۔ فکر سے مراد فکر
فردا ہے اور خون سے خونِ تمنا"

مینارِ پاکستان، فکر فردا کی ترجمانی کرتا ہے اور "قحط الرجال خونِ تمنا کی۔ مینارِ پاکستان سے مختار مسعود کو جذباتی تعلق اور اس کی مجلس تعمیر سے ان کا سرکاری ربط رہا ہے۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء کی اس نسل کے ایک فرد ہیں جس نے پاکستان کی تحریک نہ صرف اٹھتے دیکھی بلکہ جس نے اس خواب نما تحریک کو ایک ٹھوس حقیقت کی شکل دینے میں قائدِ اعظم کے

قریب ترین ساتھیوں کی طرح ان کا ہاتھ بٹایا۔ اس نسل کے بارے میں مختار مسعود نے ایک یادگار جملہ لکھا ہے کہ علی گڑھ کی اس نئی نسل نے قائداعظم کی بگھی کھینچی اور مولانا آزاد کی گاڑی روکی۔ مختار مسعود غالباً نہ قائداعظم کی بگھی کھینچنے والوں میں شامل تھے نہ مولانا آزاد کی گاڑی روکنے والوں میں، تاہم ان کی یہ کتاب قائداعظم سے ان کی عمیق ترین عقیدت کی عکاس اور مولانا آزاد سے شدید ترین نفرت کی غماز ہے۔ لیکن یہاں میں اس عقیدت اور نفرت پر کوئی رائے زنی نہیں کروں گا۔ کیوں کہ تاریخی شخصیتوں سے متعلق یہ معاملہ تاریخ ہی کے محاکمے کا مستحق اور محتاج ہے۔

"آوازِ دوست" کے دائیں فلیپ پر "تحسین سخن شناس" کے عنوان سے دو رائیں درج ہیں جن کے اوپر یا نیچے صاحب رائے کے نام نہیں دیئے گئے ہیں لیکن پہلی رائے کا اسلوب بتاتا ہے کہ وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے سوا کسی اور کی رائے نہیں ہو سکتی۔ دوسری رائے کے مصنف کا نام مجھے یوں معلوم ہے کہ مختار مسعود نے ایک گفتگو کے دوران میں بر سبیل تذکرہ مجھے بتایا تھا کہ ملا واحدی نے ان کا مضمون دیکھ کر انہیں لکھا۔ دونوں رایوں کا تعلق "مینارِ پاکستان" سے ہے۔

● رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:۔

"ان کے اس مضمون کو سب سے پہلے پڑھا گیا۔ بہت اچھا ہے، بہت ہی اچھا۔ ان کا یہ مضمون یا ایسا مضمون پہلی بار پڑھنے کا اتفاق ہوا جس سے اندازا ہوا کہ اس میں فکر و نظر کی کتنی وسعت،

گہرائی اور ثروت اور تخیل کتنی شگفتہ کار ہے جن

کا طرح طرح سے اور بہتر سے بہتر طور پر اظہار کرنے پر

وہ کتنے قادر ہیں۔ فن کار کے کمال فن اور گران

مایہ شخصیت کی یہ بڑی مستند اور مستحسن نشانی ہے۔"

● اور ملا واحدی نے لکھا تھا:۔

"لفظ لفظ قابل داد، بعض فقرے لاجواب

اور بعض صفحات داد سے بالاتر۔"

ان رایوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مینارِ پاکستان کس پائے کا مضمون ہے لیکن اس کے باوجود اس مضمون کو پڑھے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کن خوبیوں اور لذتوں کا حامل ہے۔ مختار مسعود معاشیات کے ایم اے اور ان دنوں وزارتِ مالیات کے ایڈیشنل سیکرٹری ہیں۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ

ع پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

لیکن یہ سمجھنا آسان نہیں کہ اس خاک و خمیر کے قلم سے "مینارِ پاکستان" جیسا مضمون کیوں کر بن پڑا جس میں ایک عالم، ایک مؤرخ، ایک مفکر، ایک شاعر اور ایک انشاء پرداز کی مجموعی صلاحیتیں پوری توانائی کے ساتھ کارفرما نظر آتی ہیں۔ اس کارفرمائی کی کچھ مثالیں دیکھتے چلئے:۔

"مینارِ قرارداد پاکستان کی مجلس تعمیر کی نشست تھی۔ میز کے اردگرد تمام اراکین جمع تھے...... میں بہ لحاظ عہدہ اس مجلس کی صدارت کر رہا ہوں مگر عہدے کو ایک عہد وفا کا لحاظ بھی تو لازم ہے۔ میرے عہدے کا تعلق تعمیر سے ہے۔ میرے عہد کا تعلق تحریک سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے

اسے سنگ و خشت کی بجائے جہانِ نو کی تعمیر اور افکارِ نو کی تعبیر سمجھا۔۔۔۔"

" یہ ۱۸۵۷ء ہے۔ سنگِ میل پر خونِ ناحق کے چھینٹے ہیں، سماں بے نور ہے، کچھ نظر نہیں آتا۔ خستہ جانوں کا ایک قافلہ ہے جس میں غالب خستہ بھی شامل ہے۔ غالب ہندو کا مقروض ہے۔ انگریز کو پنشن کی عرضی دیتا ہے مگر اس کا جواب ہی نہیں آچکتا۔ لال قلعے کی آخری شمع اب خاموش ہو چکی ہے۔ کسی کو سوچنے کا بھی یارا نہیں۔ سنگ میل سے سید احمد ٹیک لگائے کھڑے کچھ لکھ رہے ہیں۔ شاید رسالہ اسباب بغاوت ہند" کی تصنیف ہو رہی ہے۔ اگلے سنگِ میل پر ۱۸۶۸ء لکھا ہوا ہے۔ سرسید بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیر سے کہہ رہے ہیں اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا اشتراک کسی صورت میں ممکن نہیں رہا۔

" سرسید کا مزار ہماری جماعت کے نزدیک ہی تھا مسجد میں داخل ہوں تو شمال کی جانب قبروں کی جو قطار ہے اس کے وسط میں سرسید کا مزار ہے۔ ہم نے بارہا لوہے کے جنگلے کو تھام کر حیرت سے ان کی قبر کو دیکھا یہی وہ شخص ہے جس نے ریلوے اسٹیشن پر ہندو پانی کی آوازیں سنیں تو ان کے جواب میں مسلمان تعلیم کا نعرہ لگایا۔ ہندو پانی اور مسلمان تعلیم کا فرق اور مفہوم کچھ عرصے کے بعد یوں ادا ہونے لگا۔ علی گڑھ اور بنارس ان دو شہروں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ دو نئے لفظ سننے میں آئے۔ پاکستان اور بھارت۔۔۔۔۔۔"

" مینارِ پاکستان کی بنیادوں کو تحریک کے مخالفین سے بھی فیض پہنچا ہے۔ اکثریت کی

بد اندیشی نے مسلمانوں کے لیے جو کنواں کھودا تھا،
وہی مینار کی بنیاد کے کام آیا.........."

حال کی روشنی میں ماضی کی یہ تعبیر مورخانہ ہی نہیں خلاقانہ بھی ہے۔ تاریخ اور شاعری کا کبھی ساتھ نہیں رہا اور جب کبھی ہوا ہے تو شاعری پر یہ الزام ضرور آیا ہے کہ اس نے تاریخ کو افسانہ اور افسانے کو افسوں بنا کر رکھ دیا لیکن مختار مسعود کا شاعرانہ تخیل تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی بجائے تاریخی حقائق کو اس طرح شکل و صورت عطا کرتا ہے جس طرح بقول شیکسپیئر شاعر بے نام چیزوں کو نام اور بے شکل چیزوں کو شکل عطا کرتا ہے۔ حقائق سے پیدا ہونے والے واقعات کو سبھی دیکھتے ہیں لیکن واقعات میں چھپے ہوئے حقائق تک بہت کم لوگوں کی نظریں پہنچتی ہیں۔ "آوازِ دوست" قدم قدم پر اس بات کا ثبوت دے رہی ہے کہ مختار مسعود واقعات کی روح میں اتر کر حقائق تک پہنچنے کا فن جانتے ہیں۔

"قحط الرجال" مینارِ پاکستان کے مقابلے میں نہ صرف ایک طویل تر مضمون ہے بلکہ عظیم تر کوشش بھی۔ اس میں انہوں نے اپنی واقعات و مشاہدات اور تجربات و تاملات سے بھرپور زندگی کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ "نچوڑ" کا لفظ اسلیئے استعمال کر رہا ہوں کہ اگرچہ یہ مضمون تقریباً دو سو صفحے کو محیط ہے لیکن اگر انہوں نے اس مضمون میں اپنی زندگی کا نچوڑ پیش کرنے کی کوشش نہ کی ہوتی تو یہ مضمون اتنا طویل مضمون ہونے کی بجائے ایک ضخیم کتاب بن گیا ہوتا۔ شعر و ادب کا ہر بڑا کارنامہ صرف ایک طرزِ تحریر کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ ایک طرزِ حیات کا حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح میر کی سی شاعری کے لئے

میر کی سی زندگی بسر کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح مینارِ پاکستان اور قحط الرجال جیسے مضامین لکھنے کے لئے صرف الفاظ پر قادر اور ایک اسلوب کا موجد ہونا کافی نہیں بلکہ مختار مسعود کی سی زندگی اور ان کے جیسے کیریر کا مالک ہونا بھی ضروری ہے۔ مختار مسعود، علامہ اقبال کے خطوط کے مشہور مگر نایاب مجموعہ "اقبال نامہ" کے مرتب اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مشہور استاد معاشیات پروفیسر عطاء اللہ کے چشم و چراغ ہیں۔ اگرچہ "قحط الرجال" میں انہوں نے اپنے والدین کے بارے میں دو چار ہی جملے لکھے ہیں لیکن ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ذہن کی تشکیل اور کردار کی تربیت میں ان کے والدین نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تعلیمی زندگی علی گڑھ کے ماحول میں گزری جہاں کے طلبہ کو ہر طرح کی عظیم شخصیتوں کو دیکھنے اور سننے کے مواقع ملتے رہے ہیں۔ مختار مسعود اپنے زمانے کے نہایت ہونہار طالب علم اور یونیورسٹی کے نہایت ممتاز مقرر رہ چکے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی زمانے میں تعلیم سے فارغ ہو کر وہ اعلےٰ ملازمت کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور اپنی امتیازی کامیابی کی بدولت آج وہ نہ صرف ایک نہایت اعلےٰ سرکاری منصب پر فائز ہیں بلکہ پاکستان کے ممتاز ترین عہدیداروں میں شمار ہوتے ہیں۔ منصبی فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں انہیں دنیا کے بہت سے ملکوں اور متعدد عظیم شخصیتوں کو بھی دیکھنے کا موقع ملا ہے اور ملتا رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی گرہ میں مختار مسعود کے سے ذہن و ذہانت اور علم و دانش کا سرمایہ لے کر دنیا کی سیاحت کو نکلے تو واپسی میں اس کا دامن یقیناً بیش بہا معلومات، تجربات و مشاہدات

سے مالا مال ہو گا۔

قحط الرجال، مختار مسعود کا ذہنی اور روحانی سفر نامہ ہے۔ اس سفر پر وہ اس وقت روانہ ہوئے تھے جب وہ مسلم یونیورسٹی ہائی سکول میں پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ اس زمانے میں ایک دن ایک چینی مسلمان عالم ان کے گھر چائے پر آئے۔ ان کے والد نے ان سے فرمایا کہ وہ چینی عالم سے ملیں اور ان کے اوٹو گراف حاصل کریں۔ اوٹو گراف حاصل کرنا بیسویں صدی کے مقبول ترین تہذیبی فیشنوں میں سے ہے مگر مختار مسعود کی اس طالب علمی کے زمانے میں یہ فیشن اتنا عام نہ تھا جتنا کہ اب ہے۔ مختار مسعود پہلی مرتبہ اوٹو گراف کے لفظ اور تجربے سے آشنا ہو رہے تھے۔ قحط الرجال میں لکھتے ہیں کہ:۔

- "محمد ابراہیم شا کیو جن تو دستخط کرنے اور چائے پینے کے بعد رخصت ہو گئے۔ وہ ایک طویل سفر پر نکلے ہوئے تھے اور ان کے دستخط کی بدولت میں بھی ایک طویل سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ میرا یہ سفر آج بھی جاری ہے"۔

قحط الرجال، اس ناتمام سفر کا سفر نامہ ہے اور اردو کے تمام سفر ناموں سے قطعاً ایک مختلف چیز ہے۔ جب مختار مسعود نے اپنے اوٹو گراف البم پر چینی عالم سے پہلا اوٹو گراف لیا تو قدرتی طور پر ان کے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ اب کس کے اوٹو گراف لیے جائیں۔ اس موقع پر ان کے والد نے انہیں ایک ایسی نصیحت اور ہدایت کی جسے اپنی گرہ میں باندھ لینا ہر آدمی

کا فرض ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ :۔

• "اوٹو گراف البم کے صفحات ہوں یا زندگی کا سادہ ورق انہیں پُر نہیں ہونا چاہیئے۔ جاؤ نگہ انتخاب کو کام میں لاؤ۔ بڑے آدمی زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔ ان سے تعارف کے لیے کارلائل سے مدد مانگو۔ ان سے ملاقات کے لئے پلوٹارک کے پاس جاؤ۔ اُن کو سمجھنے کے لئے سعدی سے لے کر سیموئل اسمائل تک سب کے دروازے پر دستک دو۔"

مختار مسعود نے ایک سعادت مند اور اقبال مند بچے کی حیثیت سے اس نصیحت اور ہدایت کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ اس پر سختی کے ساتھ تمام عمر کاربند رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اوٹو گراف کے بہت سے صفحات سادہ رہ گئے لیکن ان کی زندگی کا کوئی ورق سادہ نہ رہا۔ انہوں نے اپنے اوٹوگراف میں صرف ان شخصیتوں کو جگہ دی جن سے وہ ذاتی طور پر متاثر تھے یا متاثر ہوئے۔ زندگی نے انہیں ایسی متعدد شخصیتوں کے قریب آنے کا موقع دیا جو قومی یا بین الاقوامی شہرت و عظمت کی مالک ہیں اور جن کے اوٹوگراف ہر شخص کے لئے باعث فخر ہو سکتے ہیں لیکن اگر وہ شخصیتیں مختار مسعود کے جی کو نہ لگیں تو وہ اپنے اوٹوگراف البم کو ان کے دستخط سے بچا کر گزر گئے۔ ایسی رد کردہ شخصیتوں میں ملکہ الزبتھ، مولانا ابوالکلام آزاد، آغا خان اور اولیقانٹ جیسے بھاری بھرکم لوگ بھی ہیں۔ ان کے اوٹوگراف میں مذکورہ

بالاچینی عالم کے علاوہ اور جن لوگوں کے دستخط ثبت ہیں ان میں بہادر یار جنگ، ای۔ ایم۔ فورسٹر، ملا واحدی، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، نواب بھوپال، راجہ محمود آباد، ماٹن بی، سروجنی نائیڈو اور قائد اعظم جیسے عہد ساز اور یادگار زمانہ لوگ ہیں۔ مختار مسعود کو ان میں سے ہر ایک کی مساوی قربت نصیب نہ ہو سکی، ہو بھی نہیں سکتی تھی انہوں نے ان میں سے کسی کو نزدیک سے دیکھا کسی کو دور سے اور کسی کو دیر تک۔ لیکن متاثر ہر ایک سے اس حد تک ہوئے کہ ان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی گوشہ منور ہو گیا جو روشنی اور گرمی انہیں ان شخصیتوں سے ملی ہے۔ قحط الرجال' اسے دوسروں تک منتقل کرنے کی ایک کوشش ہے اور غالباً کامیاب کوشش ہے۔

ممکن ہے آپ دل میں کہہ رہے ہوں کہ آٹوگراف لینا اور آٹوگراف البم رکھنا ایک نجی مشغلہ ہے اور میں نے مختار مسعود کے اس نجی مشغلے کے ذکر کو ضرورت سے زیادہ پھیلا دیا۔ دراصل یہ پھیلاؤ یوں ضروری تھا کہ ان کے آٹوگراف البم اور ان کے مضمون "قحط الرجال" کے درمیان بڑا گہرا رشتہ ہے — وہی رشتہ جو اجمال اور تفصیل میں ہوتا ہے۔ مختار مسعود کا مضمون "قحط الرجال" انہی شخصیتوں کی قلمی تصویروں سے عبارت ہے جن کے دستخط سے ان کا آٹوگراف البم مزین اور مشرف ہے۔ اس لحاظ سے یہ مضمون قلمی خاکوں کا مجموعہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ ان سا کوں نا کینوس پروفیسر رشید احمد صدیقی کے گنج ہائے گراں مایہ یا ہم نفسان رفتہ کے خاکوں کی طرح وسیع نہیں ہے۔ لیکن اردو میں تعداد

صدیقی کے بعد اگر ان کے انداز کی خاکہ نگاری کسی اور نے کی ہے تو وہ مختار مسعود ہی ہیں۔ قحط الرجال کے خاکے اپنے رنگ و روغن کے اعتبار سے گنج ہائے گراں مایہ اور ہم نفسان رفتہ کے خاکوں سے مشابہ ہیں لیکن یہاں یہ تنبیہہ ضروری ہے کہ قحط الرجال کو خاکوں کا مرقع سمجھنا اس مضمون کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی۔ اس مضمون کا اصل موضوع اور مقصد خاکہ نگاری سے سوا اور بلند تر رہا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اپنی زندگی کے سارے تجربات و مشاہدات، تاثرات و تصورات اور خیالات و افکار کو ایک خاص انداز سے پرو دینے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں برصغیر کے مسلمانوں کی قومی زندگی کے نشیب و فراز اور طوفان و تلاطم کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور قوموں اور تہذیبوں کے زوال و انتشار پر خیال انگیز بحثیں بھی۔ یہ بحثیں خیال انگیز ہی نہیں کار آمد بھی ہیں اگر ان بحثوں کی روشنی میں ہم اپنی حالیہ تاریخ کا مطالعہ کریں تو شاید یہ سمجھنے میں دشواری نہ رہے کہ ہم قدرت کے کس قانون کا شکار ہو گئے یا ہو رہے ہیں۔

مختار مسعود نے اپنے مضمون قحط الرجال میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ مہر اس خیال کے اظہار کے لئے گنجائش نکال لی ہے جو ان کے فکر و عمل پر اثر انداز ہوا ہے۔ ایک مرتبہ ان کے والد نے ان کی طالب علمی کے زمانے میں انہیں سمجھایا تھا کہ کام کرنے والے اپنی مختصر اور مصروف زندگی میں بھی بہت سے کام کر جاتے ہیں۔ نہ کرنے والے طویل اور مصروفیات سے خالی زندگی میں بھی کچھ نہیں کر پاتے۔ اس نصیحت کے

زیرِ اثر جہاں مختار مسعود نے اپنی زندگی میں ہر طرح کی ذہنی اور علمی سرگرمیوں کے لئے گنجائش نکال لی وہاں قحط الرجال میں انہوں نے دکھایا ہے کہ ٹائن بی، ہمدانی، انسقونی ٹرولپ اور گبن جیسے لوگ عملی زندگی بسر کرنے کے باوجود بھاری بھر کم علمی کام کر گئے۔ مختار مسعود کا یہ دعویٰ اور ان کے والد کی نصیحت واقعاتی اعتبار سے درست سہی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کم سے کم فراغت میں بڑے سے بڑے کام کی انجام دہی ہر صاحب جوہر کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بہت سی صلاحیتیں ضائع ہوتی رہی ہیں جس کا قدرت کو تو کوئی افسوس نہیں ہوتا لیکن ہم انسانوں کو ہونا چاہیئے اور نتیجتاً انسانی صلاحیتوں کو ضائع ہونے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ جو قوم اپنے جوہرِ قابل کو پھولنے پھلنے کے لئے ضرورت بھر وقت، مناسب ماحول اور ضروری سہولتیں فراہم نہیں کرتی وہ اکثر اس کے بڑے کاموں سے محروم رہ جاتی ہے۔ سعی و عمل، جد و جہد اور محنت و کاوش کے فوائد پر اقبال سے زیادہ زور کس نے دیا ہے لیکن اتنا اعتراف تو انہیں بھی تھا کہ :-

ے نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو

اقبال نے تہذیب حجازی کے مزار (جزیرہ سسلی) کو دیکھ کر کہا تھا کہ :-

ع غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا

اقبال کی شاعری صرف غم نصیبی اور ماتم سرائی نہیں ہے لیکن اردو

شاعری میں جس پائے کی قومی غم نصیبی اور ماتم سرائی اقبال کے یہاں ملتی ہے اردو نثر میں کم و بیش اس معیار و مرتبے کی غم نصیبی اور ماتم سرائی مختار مسعود کے یہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ معلوم نہیں آواز دوست جس قومی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ لکھی گئی ہے اس قومی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ پڑھی جا سکے گی یا نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب جو ہر قسم کی جذباتیت سے پاک ہے ان قومی جذبات کے ساتھ لکھی گئی ہے جن سے سرسید۔ حالی۔ شبلی۔ نذیر احمد۔ محمد حسین آزاد۔ اقبال۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ حسرت موہانی۔ ظفر علی خاں۔ نواب بہادر یار جنگ اور قائدِ اعظم جیسے مسلم مشاہیر سرشار تھے لیکن جو اب برِ صغیر کے مسلمان ادیبوں میں جنس نایاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح حالی اور اقبال کی شاعری صرف مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان نہیں بلکہ عروج کا ولولہ انگیز رزمیہ اور زوال کا فکر انگیز مرثیہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوش آئند مستقبل کی بشارت بھی ہے اسی طرح مختار مسعود کی "آواز دوست" برِ صغیر کے مسلمانوں کے تقریباً سوا سو سال کے خواب و بیداری، جمود و جہاد، حوصلہ و ہزیمت، پیش قدمی و پسپائی، تعمیر و تخریب اور فتح و شکست کی تصویر، تاریخ اور تجزیہ ہی نہیں بلکہ اپنی قوم سے اس امید اور اپنی قوم پر اس اعتماد کا اظہار بھی ہے جو قومی انحطاط و انتشار کے سارے آثار کے باوجود ان کے دل میں موجود و موجزن ہے۔ وہ اپنی رجائیت میں کہاں تک حق بجانب ہیں اس کا جواب تو مستقبل ہی دے سکتا ہے لیکن ان کی جو خصوصیات انہیں حالی اور اقبال کا ہم ردیف بنا دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک وہ رجائیت بھی ہے جو بے

رجحانہ حقیقت پسندی کا نتیجہ ہو یا نہ ہو والہانہ قوم پرستی کا نتیجہ ضرور ہے۔

آوازِ دوست، ایک ہشت پہلو کتاب ہے۔ یہ مختلف لوگوں کو مختلف حیثیتوں سے پسند آئے گی۔ نہ جانے اس کی کیا کیا تعبیریں ہوں گی لیکن یقین ہے کہ اس کا شمار ان کتابوں میں ضرور ہوگا جو علم کو انشا پردازی کی رعنائی اور انشا پردازی کو فکر کی گہرائی عطا کرتی ہیں۔

آوازِ دوست، پہلو دار ہی نہیں تہ دار تصنیف بھی ہے۔ یہ کتاب بظاہر جتنی زود ہضم نظر آتی ہے غالباً اتنی زود ہضم نہیں ہے۔ اس میں کئی طرح کے دھوکے دینے کی صلاحیتیں موجود ہیں مثلاً اس کی سادگی پہ رنگینی اور رنگینی پر سادگی کا دھوکا ہوتا ہے۔ اسی طرح بظاہر یہ کتاب مختار مسعود کی سرگزشت معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں ان کے حالات و حوادث سے زیادہ قوم کے حالات و حوادث کا عکس ملتا ہے۔ بعض کو یہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تصنیف تحریر کم ہے اور طرزِ تحریر زیادہ۔ اسے پڑھتے وقت ان دھوکوں سے ہشیار رہنے کی ضرورت ہے خصوصاً اس لئے کہ اگرچہ مختار مسعود کا اندازِ بیان مشکل یا مبہم نہیں ہے لیکن اس کتاب کے اصل موضوع اور متعدد کو OBLIQUE انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ادب میں شاعری کو تاثیر و توانائی کے اعتبار سے نثر سے برتر مانا گیا ہے لیکن ادب کی تاریخ ایسی مثالوں سے خالی نہیں جن میں بعض نثر نگار تاثیر و توانائی اور دلکشی و دلبری میں شاعروں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں خود ہمارے ادب میں حسرت موہانی جیسے مقبول شاعر نے اپنی رسوائے زمانہ سچائی کے ساتھ اعتراف کیا تھا کہ

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
شعر حسرت میں وہ مزا نہ رہا

واقعہ یہ ہے کہ بعض نثر نگاروں کی نثر شاعری کی بلند ترین لطافتوں کو نہ صرف چھو لیتی ہے بلکہ لطف و لذت کے اعتبار سے بہت سے شاعروں کی شاعری کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ مختار مسعود بھی ان معدودے چند نثر نگاروں میں سے ہیں جن کی نثر کو بہت سے مشہور و ممتاز شاعروں کی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ ویسے یہ فیصلہ ہمیشہ انفرادی ہوگا کہ کس شاعر پر کس نثر نگار کو ترجیح دی جائے۔

مختار مسعود قدر اول کے انشا پرداز ہیں۔ انشا پردازی کے معاملے میں انہیں ایک حد درجہ خود آگاہ فن کار کہنا بھی غلط نہ ہوگا۔ گذشتہ پچیس سال کے اندر ابھرنے والے پاکستانی ادیبوں (ہندوستانی ادیبوں میں صرف خورشید الاسلام کا نام لوں گا۔) میں غالباً مشتاق احمد یوسفی اور مختار مسعود سے بہتر انشا پرداز اور کوئی نہیں ہے۔ دونوں کے درمیان کئی باتوں کے مشترک ہونے کے باوجود دونوں کا ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد ہونا بھی واضح ہے۔ دونوں کی ذہنی آبیاری علی گڑھ میں ہوئی ہے دونوں نے اپنے اپنے اسلوب کا چراغ جس چراغ سے جلایا ہے وہ علی گڑھ ہی کا چراغ ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی میں یقیناً کوئی ایسی کمی ہوگی جس کی بنا پر وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح مختار مسعود کے البم میں جگہ نہ پا سکے۔ لیکن ان کا معاملہ مولانا آزاد سے مختلف یوں ہے کہ وہ مختار مسعود کے البم میں جگہ نہ

پانے کے باوجود ان کے دل و دماغ اور ان کی شخصیت کے رگ و ریشے میں جاری وساری نظر آتے ہیں۔ میں مشتاق احمد یوسفی اور مختار مسعود کے باب میں رشید احمد صدیقی کا حوالہ دے کر ان دونوں ادیبوں کی انفرادیت سے انکار یا ان کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک ان دونوں کا رشید احمد صدیقی سے وہی رشتہ ہے جو ہیگل سے پروفیسر بریڈلی اور پروفیسر میک ٹگارٹ کا ہے دونوں HEGELIAN کہلانے کے باوجود فلسفے میں اپنا اپنا مقام اور اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن جس طرح ہیگل کے بغیر پروفیسر بریڈلی اور پروفیسر میک ٹگارٹ کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح رشید احمد صدیقی کے بغیر مشتاق احمد یوسفی اور مختار مسعود ممکن نہ ہوتے۔ اردو کے یہ دونوں مایہ ناز انشا پرداز رشید احمد صدیقی کے اسالیب کے تسلسل اور توسیع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں مزاح نگار رشید احمد صدیقی نے مشتاق احمد یوسفی کی تعمیر میں حصہ لیا ہے وہاں سنجیدہ نگار رشید احمد صدیقی مختار مسعود کی تشکیل میں کارفرما رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آواز دوست، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسان رفتہ، ذاکر صاحب اور آشفتہ بیانی میری جیسی اہم بلکہ عظیم کتابوں کے قبیل کی چیز معلوم ہوتی ہے۔

اچھے شعر کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ نثر کی نثر ہو اور شعر کا شعر۔ میرے نزدیک بہترین نثر کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ بری شاعری کے تمام معائب سے محفوظ ہو اور اس میں اچھی یا اعلٰے شاعری کے لطیف ترین محاسن موجود ہوں۔ مختار مسعود کی نثر ہر جگہ میرے اس مطالبے کو پورا کرتی نظر آتی ہے۔ حسنِ تخیل، حسنِ تعبیر، نازک خیالی، نکتہ سنجی، معنی

آفرینی، رمز و کنایہ اور نہایت لطیف طنز و مزاح وہ خوبیاں ہیں جو اعلیٰ درجے کی شاعری سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہیں لیکن اگر مجھ سے مختار مسعود کی نثر کے نمایاں پہلوؤں کو بیان کرنے کی فرمائش کی جائے تو میں شاعری کی ان اصطلاحات سے کام لئے بغیر اس فرمائش کی تعمیل نہ کر سکوں گا۔ ان کی اس نثر کے کچھ نمونے دیکھتے چلیے جس نے بہترین نثر اور بلند ترین شاعری کے فرق کو مٹا دیا ہے:۔

- "جس جس کو اہل شہادت میسر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہے۔ جس آبادی میں اہلِ احسان نہ ہوں اسے خانہ جنگی اور خانہ بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس تمدن کو اہلِ جمال کی خدمات حاصل نہ ہوں وہ خوش نما اور دیرپا نہیں ہوتا۔"
- "دیما ستھنیز نے شجاعت کے بارے میں اتنی شاندار تقریریں کیں کہ ہزاروں آدمی انہیں سن کر میدانِ جنگ میں جان پر کھیل گئے۔ مگر جب وہ خود میدانِ جنگ میں پہنچا تو موقع ملتے ہی فرار ہو گیا۔ یہ فرار ہمیں ہر ناصح، محتسب اور مصلح کی زندگی میں ملتا ہے۔"
- "وہ (ملا واحدی) سادہ لکھنے اور سچ بولنے کے عادی ہیں۔ سچ کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اسلئے اس کی مثالیں لانے کے لئے انہیں دلی سے باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

● "نہ دریا میں پانی نہ انسان میں دریا دلی۔ اس عالم میں جس نے چلنے کے لئے راستہ دیدیا وہی خضر ٹھہرا اور جس نے زندہ رہنے دیا وہ مسیحا بن گیا"۔

● "سروجنی کی تربیت میں نہ جانے کون کون سے عوامل ہوں گے مگر اس کی بصیرت میں گنگا جل سے زیادہ آبِ زمزم کا اثر ملتا ہے"۔

● "یہ علمی کام ایسے نہیں ہوا جیسے آج کل بڑے لوگ ہم زاد کے لکھے پر دستخط ثبت کر کے مصنف بن بیٹھتے ہیں۔ وہ طریقہ جو بچوں کی پیدائش کے لئے حرام ہے وہ کتابوں کی تصنیف کے لئے کیوں کر حلال ہو سکتا ہے"۔

● "پاکستان قضائے الٰہی ہے اور ہندوؤں کا کوئی جوش یا واویلا اسے آگے پیچھے نہیں کر سکتا۔ جوش اور واویلے کے کئی نام ہیں۔ یہ نام ہم قافیہ تو نہیں مگر ہم وزن ضرور ہیں۔ کل یہ شردھانند، مونجے اور ساورکر کہلاتا تھا۔ آج اسے ٹنڈن اور مکرجی کہتے ہیں۔ کل اسے مدہوک اور گوال کر کہا جائے گا۔ سچ ہی تو کہتے ہیں کہ ہندو مذہب میں آواگون برحق ہے"۔

● "منتشر تھے تو قومیت کہلاتے تھے متحد ہوئے تو قوم بن گئے۔ مایوس تھے تو علیحدہ ووٹ کا حق مانگتے تھے۔ پرامید ہوئے تو علیحدہ وطن کا مطالبہ کرنے لگے

جو کل تک برِ عظیم میں محکوم اقلیت سمجھے جاتے تھے وہ اس کے چوتھے حصے میں حکمراں اکثریت بن گئے۔ سات سال کے مختصر عرصے میں وہ تحریک جسے دیوانگی خام خیالی اور محض شاعری کہا جاتا تھا فرزانگی، پختہ کاری اور نثر میں لکھی ہوئی تاریخ بن کر سامنے آگئی۔"

- "اسلام پر ایمان لانا ہو تو وہ ٹائن بی کی معرفت بھی لایا جا سکتا ہے۔"

"رزق ہی نہیں کتابیں بھی ایسی ہوتی ہیں جن کے پڑھنے سے پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے۔"

- "جب مسجد بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں، جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے ملک کی بجائے مفاد اور ملت کی بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آئے اور زندگی سے محبت ہو جائے تو صدیاں یونہی گم ہو جاتی ہیں۔"

- "قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرجال میں زندگی۔ مرگِ انبوہ کا جشن ہو تو قحط۔ حیاتِ بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرجال۔"

مختار مسعود ایسے فقرے لکھنے کے ماہر ہیں جو پڑھنے والے کے ذہن پر بولتے ہوئے شعر کی طرح نقش ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی تحریر کا حسن صرف فقروں میں نہیں پوری عبارت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

حسنِ خیال اور حسنِ بیان کے اعتبار سے جتنی SUSTAINED عبارتیں ان کے یہاں ملتی ہیں۔ اس کی مثالیں دوسروں کے یہاں ملیں گی تو ضرور لیکن کم بہت ہی کم۔

مختار مسعود نے قحط الرجال میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیئے اور سزا کے طور پر روک لئے جاتے ہیں"۔

اگر یہ خیال صحیح ہے تو مختار مسعود سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ "آواز دوست" جیسی خوبصورت اور خیال افروز کتاب اور اس کی تازہ و تابندہ نثر ہم پاکستانیوں کے کن اعمال کا انعام ہے؟

★ ★



زندہ دل درویش شاعر

جمیل ملک

رضا ہمدانی نے جب غزل گوئی کا آغاز کیا تو اس کی پشت پر اُردو، فارسی اور پشتو غزل کی روایات موجود تھیں۔ حافظؔ وسعدیؔ، غالبؔ و مومن کی غزلیہ روایات کے ساتھ ساتھ اُس کے ذہن میں رحمٰن باباؔ اور خوشحال خاں کے شعری، افکار کا وہ سرمایہ بھی تھا جس سے استفادہ کر کے رضا ہمدانیؔ نے اپنے ہمزاد اور رفیق کار فارغ بخاری کی معیت میں پتھروں کے دیس میں شعر و شعور کی وہ شمع جلائی جس کی لو سے بے جان پتھروں میں بھی زندگی کی لہر دوڑ گئی اور ایک ایک پتھر یوں تن کر کھڑا ہو گیا کہ آنے والے مسافروں کے لئے سنگِ میل کے منصب سے سرفراز ہوا۔

غزلیات کے پہلے مجموعے رگِ مینا میں رضا ہمدانی جہاں اس روایت سے منسلک ہے جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے وہاں اس کی غزل دل کی دنیا سے نکل کر شعور کی بلندیوں کی طرف جست بھرتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ خود شاعر کو اس کا احساس ہے غالباً اسی خیال سے اس نے اِس مجموعے کو دَورِ جنوں اور عہدِ شعور کے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ دَورِ جنوں کی غزلوں میں شاعر گلستانِ محبت کی رنگین و سرسبز روشوں، حسنِ فطرت کی بسیط وادیوں اور شیشۂ شراب کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے، یہ دَور رضا ہمدانیؔ کے عنفوانِ شباب کی سرمستیوں

کی یادگار اور سرسبز و شاداب سرزمین پر اس کی آوارہ خرامی کا منظر ہے جہاں اس پر دن رات اک گونہ بے خودی کا عالم طاری رہتا ہے وہ اپنے آپ سے بیخبر مظاہر فطرت کی آغوش میں اپنے گلستانِ محبت کی بہار سے جسمانی قربت کا طلبگار نظر آتا ہے، اس دور میں اُس کے خیالات سراسر اُس کے جذبات کے تابع رہتے ہیں اور اس کی محبوبہ کا سراپا بھی دراصل اس کے جذبات کے ضمیر سے ہی وجود میں آتا ہے وہ اپنے ہی گرم لہو کی آگ میں جلتا ہے اس سے تخلیق کی لذت حاصل کرتا ہے اور اپنے ہی جذبات کے پیکر کو محبوبہ کے قالب میں ڈھال کر جب اسے اشعار کے آبگینوں میں اتارتا ہے تو کہیں اُسے صبح بنارس اور شام اودھ کا نام دے کر ارضی فضا اور جمال فطرت سے قریب تر کر دیتا ہے اور کہیں اسے نظم دلآرا، اور بیت الغزل، کہہ کر اپنے جذباتی پیکر کو فن کی صورت میں مجسم کر دیتا ہے ؎

اے میری صبح بنارس، اے میری شام اودھ
اے مری شیرازۂ لیل و نہار اچھی تو ہو
اے مری نظمِ دلآرا، اے مری بیت الغزل
اے مرے رنگیں تخیّل کی بہار اچھی تو ہو

دورِ جنوں، کی غزلوں میں رضاؔ ہمدانی اپنے شباب کی آگ میں بار بار جلنے کے باوجود شعور کی روشنی سے محروم رہتا ہے۔ یوں بھی محبت کے دیوتا، کی آنکھیں نہیں ہوتیں وہ تو دل کی آنکھوں سے دیکھتا اور سوچتا ہے جہاں سے اس کے تجربات کی ندرت اور دارفتگی ہر لحظہ ہمکتی رہتی ہے۔ رضاؔ کے عہد جنوں، کا سلسلہ بھی محبت کے دیوتا کی اسی معصومیت، سرمستی، سادگی اور لطافت سے مماثل ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ زمانہ رضاؔ کی غزل کے لڑکپن

کا زمانہ ہے۔ والہانہ پن اور وارفتگی کے باوجود رضا اپنی نو آموزی اور نوگرفتاری کے سبب کہیں کہیں لڑکھڑاتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے جو بہر حال اس عمر کا خاصا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس نے اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑا ہونے کا قرینہ نہیں سیکھا یوں بھی جب عالمِ بے خودی میں شاعر کے نزدیک 'ساغرِ نشاط'، اور شیشۂ شراب کے سوا کوئی اور فلسفہ حریف گردشِ دوراں ہونے کی سکت نہ رکھتا ہو تو اس طفل معصوم کی لڑکھڑاہٹ اور ناپختہ کاری بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے ؎

جز ساغر نشاط و بجز شیشۂ شراب

کوئی حریف گردشِ دوراں نہیں رہا،

لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد شاعر کی نظروں کے سامنے ایک ایسا سورج طلوع ہوتا ہے کہ وہ اچانک خواب بیخودی سے چونک اٹھتا ہے۔ جب وہ آنکھیں کھولتا ہے تو اسے سوائے چکا چوند کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ۱۹۴۷ء کا حادثۂ عظیم اُسے آن واحد میں دور جنوں سے اجتماعی شعور کی قتل گاہوں میں لے آتا ہے جس کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لئے نہ وہ ابھی جذباتی طور پر تیار تھا اور نہ اس کی ذہنی سطح ہی اس غیر متوقع شعوری بیداری کے ردِّ عمل کی متحمل ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اس سنگین حقیقت سے دوچار ہوتے ہی کہہ اُٹھتا ہے ؎

دیکھیں جنوں اب کیا رنگ لائے

آتو چلی ہے کانوں میں جھنکار

اس جھنکار کا صوتی آہنگ آہستہ آہستہ بڑھتا اور پھیلتا ہی جاتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے رضا کی غزل پوری طرح اس آہنگ کی گرفت میں آجاتی ہے اور وہ اپنے لڑکپن کی ایمائیت، تازگی، اور وارفتگی کو بھول کر براہِ راست اور،

دو ٹوک انداز میں بات کرنے کا انداز سیکھ لیتا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی ذہنی سطح پر نئے شعور کو جذب کرنے کی کڑی آزمائش میں مبتلا ہے، اس کشمکش میں اس کا جذباتی پیکر بھی مجروح ہو جاتا ہے اور اس کا شعوری ہیولی بھی غزل کے سانچے میں ڈھل کر صورت پذیر نہیں ہو پاتا۔ نتیجہ یہ کہ کبھی تو وہ غالب کی طرح غزل کی تنگ دامانی کا شاکی نظر آتا ہے اور کبھی اقبال اور ترقی پسند مصنفین کی مشترکہ روایات کو اپناتے ہوئے اپنی شخصیت کی چھاپ کے بغیر، انہی کی مستعار آواز میں اپنے خیالات کو غزل کا جامہ پہنا دیتا ہے ؎

رضا یہ غزل آن کیونکر سمیٹے مضامین اونچے ہیں، مفہوم گہرے

جواں دلوں کا فسانہ کچھ اور کہتا ہے۔ مگر شعور زمانہ کچھ اور کہتا ہے

قافلہ راہ میں نہ لٹ جائے ۔ کس طرف آپ جا رہے ہیں حضور

امتیاز ہوس و عشق وہاں کیا ہو رضا ۔ کہ زر و سیم پہ تلتا ہو جہاں پیار ہنوز

پہلی جنگ آزادی کا ردِّ عمل غالب کے ہاں یوں آئینہ ہو گیا تھا:

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے

اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

اس شعر میں ایک قوم کی شکست کے بعد ایک فرد کے المیے کو ابھارا گیا ہے جس کی اپنی آواز گم ہو چکی تھی، اس شعر کی اپنی روشنی میں غالب کا معاشرہ نفیٔ ذات کی علامت بن کر ابھرتا ہے جہاں غالبِ خستہ کے بغیر بھی حیات و کائنات کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ رضا ہمدانی کے عہد تک آتے آتے قوم کی قوم خوابِ گراں سے جاگ اٹھتی ہے اور غمِ ذات میں شعورِ حیات کروٹیں لینے لگتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ارتقائی نقطے پر پہنچ کر جب یہ جوالا مکھی پھٹتا ہے تو جہاں شبِ تاریک میں،

اچانک روشنی کے کوندے لپک جاتے ہیں وہاں اس آگ کے سیلاب میں ڈوب کر کتنی ہی جانیں تلف ہو جاتی ہیں اور کتنے ہی چراغ بھڑک کر ایک دم بُجھ جاتے ہیں خواب و جنوں کے تمام مناظر یکے بعد دیگرے ڈرامائی انداز سے رضا ہمدانی کے سامنے سے گذر کر اُس کی نظروں کو خیرہ کر جاتے ہیں مگر آہستہ آہستہ اُس کی آنکھیں نہ صرف روشنی اور اندھیرے سے مانوس ہو جاتی ہیں بلکہ روشنی اور اندھیرے کی ظاہری اور باطنی کشمکش کا سراغ بھی لگا لیتی ہیں۔ یہیں سے اس کی شعوری بیداری کا حقیقی دور شروع ہوتا ہے۔ تجربے، کشمکش اور آزمائش کے کٹھن مراحل سے گزر کر اس کے تخیّل میں جذبے کی چاشنی شامل ہو جاتی ہے جو اُس کے شعور کی تلخی اور گرانباری کو کم کر کے اسے سبک اور دلکش بنا دیتی ہے اب یہ آواز شاعر کے دل و دماغ سے ابھرتی ہوئی اس کی اپنی ہی نہیں ہم سب کی آواز بھی بن جاتی ہے۔ جو اگرچہ گھائل ہو چکی ہے مگر طاقت پرواز ضرور رکھتی ہے اور ایک نئی سمت کو دریافت کرنے میں مصروفِ تگ و تاز ہے ؎

دمک اٹھی ہے سیہ رات کی جبیں کیسے

یہ روشنی کہیں بجھتے چراغ کی تو نہیں!

تیرگی کا کبھی گلہ نہ کریں - ہاتھ کو ہاتھ بھی اگر چھُو لے

کس آس پہ زندگی گزاریں - اُڑتا سا پیام بھی نہیں ہے!

عقیدت کا برا ہو تجھ کو صیّاد - چمن والے خدا کہنے لگے ہیں

یہ میکدہ کی روایت رضاؔ عجیب سی ہے

کہ جس نے ہوش لٹایا، وہ ہوش مند ہوا

مَیں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ رضاؔ کی شاعرانہ پرداخت کے پس منظر میں

غزل کی کلاسیکی روایات کے ساتھ ساتھ خوشحال خاں اور رحمان بابا کے افکار کا وافر ذخیرہ بھی کام کر رہا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رضا بھی انہیں روایات سے کسبِ فیض کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے دوسری جنگِ آزادی کے نقطۂ عروج پر پہنچ کر وہ اس، روایت سے بغاوت کر دیتا ہے اور بظاہر اپنی غزل کے جذباتی پیکر سے کنارہ کشی کر کے شعور کا دامن تھام لیتا ہے لیکن درحقیقت وہ شعوری کوشش کے باوجود اس جذباتی پیکر کو اپنے احساس و وجدان سے الگ نہیں کر سکتا۔ اتنا ضرور ہوتا ہے کہ اس کی غزل کا یہ جذباتی ڈھانچہ اپنا آب و رنگ بدل کر ایک مثبت رومانی کردار کی صورت میں ڈھل جاتا ہے جس کے خدوخال سے اب تمازت، برانگیختگی اور تمکنت کی بجائے متانت، ٹھہراؤ، سنجیدگی اور دلآویزی ہویدا ہے۔ بہرحال رضا ایک طویل جدوجہد اور سخت دشمت سے گزرنے کے بعد اپنی غزل کے سانچے میں ایک ایسا کردار تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جس کی بوباس خوشحال خاں کے واسطے سے بہت پہلے اس کے مشامِ جاں کو معطر کر چکی تھی ؎

طریں نزع والم اور مصائب دوراں
مجھے ملے ہیں تری زلف کی رعایت سے
رانجھے کا شور کوئی نہ سنتا یہاں کبھی
پیدا نہ ہوتا ہیر کا پیکر جو شور سے

(خوشحال خاں۔ مترجم رضا)

اس رومانی کردار کی تخلیق کے بعد رضا کی غزل کے آہنگ میں انوکھی سخت بیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے احساس و شعور کی ساری داستان اسی کردار کے سیاق و سباق میں بیان کرتا ہے۔ یہ وہ پیکر ہے جو کبھی شمعِ خاموش کی صورت پگھل پگھل کر

اور دلیل سحر بن بن کر فنکاروں کے احساس و وجدان میں لو دیتا رہا ہے اور کبھی اس کا سراپا زمانے بھر کے دکھوں اور مسرّتوں کی علامت بن گیا ہے۔ ہمعصر شعراء کی طرح رضاؔ کے ہاں بھی یہ کردار اندھیرے اور اجالے، مثبت اور منفی، نیکی اور بدی کی آویزشوں میں گھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شاعر کو اس کردار سے اس حد تک عشق ہے کہ وہ اسے طبقاتی تضاد معاشرتی ناانصافی اور ظلم و جور کے چُنگل سے نجات دلانے کے لئے اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ذاتی سطح پر لمس و وصال کی حسرتوں اور سیرابیوں کو تج کر وہ اس رومانی کردار کو آفاقی بلندیوں سے ہمکنار کرنے کی آرزو کو خونِ دل سے پروان چڑھانے کی دھن میں مگن نظر آتا ہے اس مقام پر پہنچ کر اس کی محبوبہ کا کردار، اس کے آئیڈیل اس کے مطمع نظر کے سامنے سے یوں جھانکتا ہے جیسے وہ ایک ہی تصویر کا دوسرا روپ ہو اگرچہ وہ اس کردار کو اپنے آدرش کی صُورت میں ہر وقت اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے لیکن اس کی فنکارانہ نظرِ ہمہ وقت اُس کی نوک پلک سنوارنے اور اس کے خدوخال نکھارنے میں مصروف رہتی ہے۔ وہ اپنے محبوبِ نظر اور اس سے وابستہ تمام یادوں، خوابوں اور انتظار کی گھڑیوں سے اپنا رشتۂ اُمیدیوں استوار کر لیتا ہے کہ اپنے آدرش سے وفاداری اُس کے لئے اصل ایمان بن جاتی ہے ؎

اس آرزو میں کہ شاید وہ چھم سے آجائے
سجائے بیٹھے ہیں پلکوں پہ اشک تر کے چراغ
تمہاری یاد کی جھنکار جاگ اُٹھتی ہے
یہ چمن چمن میں شگوفے جب آنے لگتے ہیں
یوں خیال آتے ہی ہر سانس میں محسوس ہوا

غمِ محبوب تری عمر بڑی ہو جیسے ——
جن سے ہوتی ہے بیک وقت خوشی بھی غم بھی

دل کی دنیا میں کچھ ایسے بھی خیال آتے ہیں
نہ جانے کن نگہہ ناز کے ہیں دیوانے

یہ قید و بند کا سودا جنہیں پسند ہوا
جن کی ہر ایک بات سے جھڑتے تھے منہ سے پھول

پیدا کہاں ہیں آج وہ باغ و بہار لوگ

یوں بھی رضا ہمدانی کے عہدِ شعور کی غزلیات میں غمِ دوراں کی اس قدر فراوانی ہے کہ اسے ذاتی دکھوں کا مداوا تلاش کرے اور زلفِ محبوب کے گھنیرے، سائے میں سانس لینے کی فرصت کم ہی ملتی ہے۔ رضا کے دورِ جنوں، کی آوارگی اور وارفتگی کے پیشِ نظر اُس کے فکر و نظر کی یہ احتیاط اور تہذیب ایک معجزے سے کم، نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعوری طور پر ایک ارفع و اعلیٰ مقصد کے لئے اپنی ذات کو عنفوانِ شباب کی آوارہ مزاجی اور بے راہروی سے الگ کر کے اس کی تادیب و تہذیب کرنے کا فریضہ سنبھال لیتا ہے اس سارے عمل میں رضا کی فطری شرافت اور روائتی وضعداری کو بھی بڑا دخل ہے جو اِس دور میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ باالفاظ دیگر رضا کے عہدِ شعور کی غزل کو اُس کی خود احتسابی، ضبطِ نفس اور جمالیاتی شعور کی بازگشت کہا جا سکتا ہے جس نے اس کی آواز کو معنویت اور توانائی بخش دی ہے۔ اب اس کی غزل کا رومانی کردار جب تشبیہہ و استعارہ کا پیرہن زیب تن کرتا ہے تو اس میں روحِ تغزل اپنی تمام تر رنگینیوں سمیت سمٹ آتی ہے ؎

کہیں نہ وضعِ محبت پہ آنچ آجائے ۔ تمہاری یاد میں مرتے ہیں اور خموش ہیں ہم

سوچتا ہوں کہیں گزرے ہوئے رومان نہ ہوں

چند سائے میرے افکار میں لہراتے ہیں

وہ اندھیرا ہے رضاؔ ، پلکوں پہ

ہم نے دن کو بھی جلائے ہیں چراغ

اس طرح آنکھ سے ٹپکا ہے لہو ۔ شاخ سے پھول گرا ہو جیسے

سونپ دیں گے رقیبوں کی تقدیر کو

چھین کر پیچ و خم ہم تری زلف کے

'رگِ مینا' کی اشاعت کے بعد کی غزلیات کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اِن سے دَورِ جنوں، اور 'عہدِ شعور' کا مصنوعی پردہ ہٹ گیا ہے۔ ان غزلوں سے رومان و حقیقت، داخلیت و خارجیت فطرت و جبلت اور شعور و وجدان اس طرح گلے مل رہے ہیں جیسے جنم جنم کے بچھڑے ہوئے ساتھی ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی میں جس طرح خارجی محرکات اور داخلی تاثرات کی تقسیم ناممکن ہے اسی طرح ایک نمو پذیر فنکار اپنی تخلیقات کو تادیر خانوں میں بانٹ کر پیش نہیں کر سکتا۔ فن کا تخلیقی عمل ریاضی کے فارمولوں سے یکسر مختلف ہے کیونکہ فنکار کی ہر تخلیق کی پشت پر ہزارہا تاریخی سیاسی، ثقافتی اور نفسیاتی عمل بیک وقت کارفرما ہوتے ہیں اور کسی ناقد یا فنکار کے لئے یہ کہنا بجد مشکل ہے کہ فلاں چیز پر فلاں دور یا نظریے کی مہر ثبت ہے اور بس۔ عظیم فنکار توان تمام حد بندیوں کو پھلانگ کر اپنے لئے ایک مخصوص اور منفرد سطح کی تخلیق خود کرتا ہے میں نے دونوں ادوار کی غزلیات کو جہاں الگ الگ جانچنے کی کوشش کی ہے وہاں ایک دوسرے

پر ان کے عمل اور ردِ عمل کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا ہے اپنے اس تجزیاتی عمل کے دوران مجھے یہ احساس شدت کے ساتھ ہوا ہے کہ قارئین کی رہنمائی سے قطع نظر خود شاعر کے ذہن میں اس تقسیم وافتراق کا اثر ایک عرصے تک ضرور کارفرما رہا ہے جس کی وجہ سے اس کی غزل تیزی کے ساتھ ارتقائی مراحل طے نہ کر سکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رگ ، کے منصۂ شہود پر آنے کے بعد خود مصنف کو لاشعوری طور پر اس بات کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رضاؔ کی پچھلے دس سال کی غزلوں نے زندگی کے تمام بکھرے ہوئے متنوع موضوعات کو رنگا رنگ پھولوں کی طرح اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے جس سے اس کی تازہ غزلیں سدا بہار کیفیات کا مرقع بن گئی ہیں اب اس کے ہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی عارضی تقسیم ختم ہو گئی ہے اور غمِ ذات اور غمِ کائنات نے ہم آہنگ ہو کر اکائی کی صورت اختیار کر لی ہے عہدِ شعور کی غزلوں میں جو رومانی پیکر ابھرا تھا، اب اس میں صرف شعور کی گرمی ہی نہیں بلکہ انسانی جسم کی مہک بھی موجود ہے جس سے یقین آجاتا ہے کہ رضاؔ نے صرف نظریاتی محبوب کے لئے ہی اپنا سب کچھ قربان نہیں کیا بلکہ اُسے کسی ارضی محبوب سے بھی ضرور محبت اور صحبت رہی ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی وضعداری اور عہدِ شعور کی خود احتسابی کی وجہ سے برملا اس کا اظہار نہ کر سکا تھا۔ اب اُسے محبت کی بساط پر اپنی شکست کا بھی اعتراف ہے۔ برسوں کا سمٹا ہوا طوفان آخر کار اُس کی آنکھوں سے پھوٹ بہتا ہے مگر ساتھ ہی ضبطِ نفس کا اہتمام بھی موجود ہے وہ غزل کی پرانی روایت کے برعکس ذاتی آلام سے دوسروں کے لئے دردِ سر بننے کا قائل نہیں۔ اول اول وہ گردشِ دوراں کا حریف صرف ساغرِ شراب ہی کو گردانتا ہے مگر اب اس کی اس حد تک تہذیب ہو چکی ہے کہ بے خودی میں بھی ہوش وخرد

کا اہتمام ملحوظِ خاطر رہتا ہے۔ اسے اپنے آئیڈیل اور محبوب نظر کی سربلندی کے لئے شکستہ پائی اور کم نظری کے الزامات بھی گوارا نہیں کہ اُس کا آدرش ہی اُس کی زندگی ہے اب محبوب کو پریشان دیکھ کر اُس کے سینے میں طوفان مچلنے لگتے ہیں کیونکہ اس کی نگاہوں سے تعینات کے پردے ہٹ چکے ہیں اور وہ ہر بات شعری صداقتوں کے ساتھ بے ساختہ انداز سے کہنے کا راز پا چکا ہے ؎

آئے ہیں اپنے آپ میں ہم مدتوں کے بعد ۔ ہم پہ کھلا ہے اپنا بھرم مدتوں کے بعد
قوسِ قزح کے رنگ ہیں چہرے سے آشکار ۔ برسا ہے جیسے ابرِ کرم مدتوں کے بعد
اس دشمنِ وفا کو پشیمان دیکھ کر ، ۔ جی بھر کے آج روئے ہیں ہم مدتوں کے بعد

اس لئے کم نظری کا بھی ستم سہنا پڑا ۔ تجھ پہ محفل میں کوئی نام نہ دھرنے پائے
پاسِ آدابِ وفا تھا کہ شکستہ پائی ۔ بے خودی میں بھی نہ ہم حد سے گزرنے پائے

★ ★



باقی صدیقی

باسط سلیم

۱۹۵۰ء کا ذکر ہے ریڈیو پاکستان کے پشاور اسٹیشن سے ایک مشاعرہ نشر ہونا تھا جس میں شرکت کے لئے مقامی شعراء کے علاوہ، کراچی لاہور، اور راولپنڈی کے ممتاز شعراء کو دعوت دی گئی تھی اس قسم کا پروگرام چونکہ مدتوں بعد ہوتے ہیں اس لئے ایسے موقعوں پر ریڈیو اسٹیشن پر خاصی رونق اور چہل پہل ہوتی ہے ہر شخص خصوصاً متعلقہ شعبے کے لوگ بے حد مصروف ہوتے ہیں کچھ ایسی ہی کیفیت اس شام بھی تھی، کچھ شعراء جو پہنچ چکے تھے ایک کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور جو نہیں آئے تھے ان کا شدت سے انتظار ہو رہا تھا اتنے میں ایک دھان پان منحنی سا آدمی کمرے میں داخل ہوا ہر چند میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا تاہم یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی غلطی نہیں ہوئی کہ یہ آدمی اور کچھ نہ ہو شاعر ضرور ہے اس لئے کہ اس کی شکل و شباہت اور لباس حقیقی شاعروں جیسا تھا، گندمی رنگت چوڑی پیشانی جیسے ذہانت کا کھلا ہوا صحیفہ، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں جن میں فلاسفروں کا تفکر، بڑے بوڑھوں کے تجربات کا نچوڑ اور مشاہدات کی روشنی میر کی قنوطیت حالی کی صاف گوئی، فانی کی بددلی اور خود اکی اپنی پوری شخصیت

بیٹھی جھانک رہی تھی، پچکے ہوئے گال اور گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں، موزوں ناک، پتلے ہونٹ، اور بھنچا ہوا مضبوط جبڑہ آنے والے کی خودداری اور مستقل مزاجی کا پتہ دے رہا تھا پاؤں میں معمولی قسم کا جوتا، قمیض پاجامہ اور کوٹ پہنے ہوئے، بغل میں کمبل دبائے جب یہ شخص کمرے میں داخل ہوا تو سب پکار اٹھے آیئے باقی صاحب آیئے باقی صاحب۔

میں نے جی ہی جی میں کہا کہ میرا خیال درست نکلا، بالوں پر سن وسال اور چہرے پر آلام کی گرد لیے آنے والا شخص شاعر ہی ہے چاہتا تھا کہ بڑھ کر باقی صاحب سے ملوں اور بات کروں کہ چند اور شعراء تشریف لے آئے اور مجھے ان سے بات کرنے کا موقعہ نہ مل سکا۔

وقت ہو چلا تھا اس لیے سب سٹوڈیو کی طرف چل پڑے اور پھر چند منٹ بعد مشاعرہ شروع ہو گیا میری ساری توجہ باقی صاحب کی طرف تھی اس لیے کہ اس سے پہلے ـــــ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ـــــ انہیں کبھی دیکھا تھا نہ سنا تھا لہٰذا جب ان کا نام پکارا گیا تو ہمہ تن گوش ہو گیا۔ باقی نے اپنی طرح، ہلکی پھلکی بحر میں غزل پڑھی، غزل کیا تھی، تجربات، مشاہدات اور آفاقی حقیقتوں کا ایک ایسا مرقع تھی کہ دل پر نقش ہو کر رہ گئی۔ حاضرین نے خوب داد دی اور مشاعرے میں گرمی پیدا ہو گئی اس غزل کے چند شعر آپ بھی سن لیجئے مطلع تھا۔ ؎

ہم سبک سر رہ سر گراں ٹھہرے ‏ ‏ گفتگو دیکھئے کہاں ٹھہرے
زندگی چاہتی ہے ہنگامہ ‏ ‏ اور ہم لوگ بے زباں ٹھہرے
آپ کو کارواں سے کیا مطلب ‏ ‏ آپ تو میر کارواں ٹھہرے

گردش دہر ساتھ ساتھ رہی   ہم جدھر بھی گئے جہاں ٹھہرے

مشاعرے کے دوسرے روز بھی باقی صاحب نے جو غزل پڑھی اس کا مطلع تھا۔

تھا میسّر نہ ایک تار ہمیں   دیکھ کر ہنس پڑی بہار ہمیں

باقی صاحب نے ایک غزل اور سنائی جس کے چند شعر یہ ہیں۔

ہنسی ہنسی میں بعض اوقات   طول پکڑ جاتی ہے بات

ہم بھی چپ تم بھی خاموش،   اس کو کہتے ہیں حالات

ایسے ساتھی پر کیا ناز   جس کی ڈور پرائے ہات

تم بھی واپس نہ لا سکو   اتنی دور گئی ہے بات

یہ تھا پہلا موقعہ جب میں نے باقی صاحب کو دیکھا سنا، اور ان کی شاعرانہ عظمت کے سامنے گردن جھکا دی۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے ان دنوں پشاور اسٹیشن پر میں، احمد فراز صاحب اور مرحوم ضیا جعفری صاحب مسوّدہ نگار کی حیثیت سے کام کرتے تھے ایک دن۔ جناب ن۔م راشد نے جو ہمارے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے ہم تینوں کو بلایا اور خوشخبری سنائی کہ باقی صاحب بھی پشاور آرہے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ مسوّدہ نگار کی حیثیت سے کام کریں گے۔

ہمیں یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی اور ہم باقی صاحب کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ چند ہی دن گزرے تھے کہ باقی صاحب آگئے اور ہم سب ایک ہی

کمرے میں بیٹھ کر کام کرنے لگے اتفاق کی بات ہے کہ پشاور کا اگست اور رمضان ساتھ ساتھ آئے تھے، سخت گرمی اور روزہ زیادہ سے زیادہ گیارہ بجے تک کام کرتے اور اس کے بعد گپ لگاتے باقی صاحب کو آئے چار چھ ہی دن ہوتے ہوں گے کہ ایک دن باتوں باتوں میں یہ ذکر چل نکلا کہ ہم لوگ جب ٹرخانے پر آتے ہیں تو کس طرح لکھتے ہیں، مرحوم ضیا جعفری صاحب نے کہا کہ میں ایک کے چار بناتا ہوں۔ ہم حیران ہوئے کہ دوسرے باز تو ایک سو کے دو سو بناتے ہیں یعنی رقم دوگنی کر دیتے ہیں۔ مگر ضیاء صاحب تو ایک کے چار بنانے کا دعویٰ کر رہے ہیں ہم نے وضاحت چاہی تو فرمانے لگے میاں ہم ایک مسودے کے چار مسودے بناتے ہیں ہم نے پوچھا کہ وہ کیسے تو کہنے لگے ایک مرتبہ شعبے والوں نے دریاؤں کی کہانی کے عنوان سے فیچر پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا اور مجھ سے کہا کہ میں راوی، چناب، سندھ، اور جہلم پر فیچر لکھوں میں نے ایک فیچر لکھا اور پھر دوسرے تمام فیچروں میں صرف دریاؤں اور کرداروں کے نام بدل دیتے مکالمے وہی رہنے دیتے اس طرح ایک کے چار بنا کے سامنے رکھ دیتے اور وہ نشر بھی ہو گئے، فراز صاحب نے کہا کہ بچوں کا پروگرام میں "ہمارے شاعر" کے عنوان سے بات چیت کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ اساتذہ کے بارے میں پانچ پانچ منٹ کے مسودے لکھئے میں نے ناسخ کے بارے میں لکھا تو پروگرام پروڈیوسر نے مجھ سے اختلاف کیا کہ ناسخ کا اصلی نام امام بخش نہیں حیدر علی تھا میں نے بحث کی مگر وہ صاحب قائل نہ ہوئے میں نے کہا چلئے آپ ہی سچے

سہی چنانچہ میں نے امام بخش کاٹ کو حیدر علی لکھدیا میں نے بھی ایک واقعہ سنا دیا کہ مسلم لیگ کے ایک لیڈر مشرقی پاکستان کے دورے پر گئے اور واپس آئے تو ان سے ایک تقریر نشر کرنے کی درخواست کی گئی انہوں نے کہا کہ تقریر آپ لکھدیں نشر ہم کر دیں گے چنانچہ مجھے بلایا گیا اور کہا گیا کہ پندرہ منٹ کی تقریر بیس منٹ میں لکھ دو میں نے پورے ۲۰ منٹ میں تقریر لکھ کر رکھ دی۔

ہم تو اپنے کمالات بیان کرتے رہے اور باقی صاحب کرسی پر بے چینی سے کروٹیں بدلتے رہے آخر پھوٹ پڑے اور رو رو کر کہنے لگے۔ کہ آپ مجھے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ سب باکمال لوگ ہیں اور میں کچھ نہیں جانتا اور آپ مجھے مرعوب کرنا چاہتے ہیں یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکلے سائیکل اٹھائی اور چلے گئے اور ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ آخر ضیاء صاحب نے سکوت توڑا اور کہنے لگے چلو باسط باقی کو منا لائیں اس وقت ایک بج رہا تھا، گرمی دھوپ اور پیاس آپ نے یقیناً اگست میں روزے رکھے ہوں گے اس لیے آپ ہماری حالت کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں ناچار سائیکل اٹھائی اور چل پڑے معلوم ہوا کہ باقی صاحب حفیظ اثر کے ہاں ٹھہرے ہوتے ہیں اور وہ سول کوارٹرز میں رہتے ہیں سول کوارٹرز پہنچے دو بجے تک حفیظ اثر صاحب کا مکان تلاش کرتے رہے اور پھر انہیں ساتھ لے کر باقی صاحب کے مکان پر پہنچے جو ایک دن پہلے دوسرے مکان میں اٹھ گئے۔ تھے وہاں پہنچے تو باقی صاحب مصلی بچھائے نماز پڑھ رہے تھے نماز سے فارغ ہوئے تو ہم نے سلسلہ کلام شروع کیا مگر باقی صاحب تو غصے میں بھوت

بنے ہوئے تھے بڑی مشکل سے ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور یقین دلایا کہ مقصد آپ کو مرعوب کرنا نہیں تھا بلکہ صرف یہ کہنا تھا کہ

جب ہمیں فوری طور پر لکھنا پڑتا ہے تو کس طرح لکھتے ہیں خیریت گذری کہ باقی صاحب مان گئے بات ختم ہو گئی اور ہم نے مطمئن ہو کر اپنے اپنے گھر کی راہ لی دوسرے دن باقی صاحب آئے اور آتے ہی کہنے لگے تازہ غزل سنئے ہم نے قلم رکھ دیئے اور کہا ارشاد ——— باقی صاحب نے مطلع سنایا۔

آپ تک ہے نہ غم جہاں تک ہے جانے یہ سلسلہ کہاں تک ہے

باغ اس کا ہے، پھول ہے اس کا دسترس جس کی باغباں تک ہے

اور کہنے لگے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم یہ ہیں وہ ہیں، مگر انہیں کوئی جانتا تک نہیں شعر سنئے،

ان کی پرواز کا ہے شور بہت گرچہ اپنے ہی آشیاں تک ہے

ہم سب نے اس شعر کا خوب مزا لیا۔ اس لئے کہ باقی صاحب نے ہم پر چوٹ کی تھی۔

کچھ دن اور گزر گئے باقی صاحب ہم سب کے ساتھ بہت زیادہ مانوس ہو گئے اور ایک دن کہنے لگے یارو مجھے سخت ندامت ہے کہ میں نے تمہاری باتوں کو غلط سمجھا تھا۔ تمہارا سلوک اتنا اچھا ہے کہ اب پشاور سے جانے کی سوچتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں جب یہاں آیا تھا تو یہی فکر تھی کہ جانے پشاور کے لوگ مجھ سے کس طرح پیش آئیں لیکن یہاں پہنچ کر یہ تجربہ ہوا کہ بہت اچھے لوگ اور ساتھی مل گئے ہیں، اسی بات پر ایک تازہ

غزل سنئیے. باقی صاحب نے غزل سنائی آپ صرف مطلع سن لیجیے.

غم اور خوشی کے راستے آکر جہاں ملے کچھ مہرباں جدا ہوئے کچھ مہرباں ملے

یکم اپریل ۱۹۵۳ کو ریڈیو کے اسٹاف پر تخفیف کا کلہاڑا چلا،

جس سے ہم چاروں مسودہ نگاروں کی جڑیں بھی کٹ گئیں یعنی ہمیں نکالدیا

گیا، باقی پنڈی یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ.

پی کے تلخابۂ غم جاتے ہیں

ے، تری بزم سے ہم جاتے ہیں

فرازنے کراچی کا سفر اختیار کیا ضیا صاحب مرحوم مطب کرنے لگے اور

میں نے شہباز کے پروں تلے پناہ لے لی،

حالات کی آندھی نے ہم چاروں کو ایک دوسرے سے بہت

دور کر دیا اور ملاقات خط و کتابت یا مشاعروں تک محدود ہو گئی. مدت

گزر گئی، ۱۹۶۶ میں جب میرا تبادلہ راولپنڈی ہوا تو باقی صاحب کے ساتھ

ملاقاتوں کا مستقل سلسلہ پھر سے قائم ہو گیا اور یہ سلسلہ ۱۹۷۱ء کے

وسط میں راولپنڈی سے میرے پشاور تبادلے تک قائم رہا پنڈی میں قیام

کے دوران الطاف پرواز صاحب، صادق نیازی صاحب، عبدالقیوم صاحب

باقی صاحب اور میں روزانہ ملتے اور گپ لگاتے، ایک دن میں نے

کہا کہ باقی صاحب یا تو سبزۂ بیگانہ کا مطلب بتایئے یا چائے پلایئے

باقی صاحب کہنے لگے مطلب وطلب ہمیں معلوم نہیں لو چائے پی لو. اب

تو یہ معمول بن گیا کہ جب بھی اکٹھے ہوتے میں کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑ دیتا اور

باقی صاحب الطاف پرواز صاحب کو چائے منگوانی پڑتی پھر یہ سلسلہ شروع

کیا کہ کل سے جو بھی تازہ غزل سنائے گا وہ چائے منگوائے گا باقی اور الطاف پرواز نے بے شمار غزلیں اس طرح کہہ ڈالیں اور ساتھ ساتھ چائے کے بلوں کی رقم بھی بڑھالی۔

باقی صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں مثال کے طور پر یہ کہ وہ صدیقی نہیں ہاشمی تھے ان کی پرورش چونکہ ان کے ماموں نے کی تھی اور وہ صدیقی تھے اس لئے باقی صاحب بھی صدیقی لکھنے لگے تھے انہوں نے شادی نہیں کی اور بیوہ ہمشیرہ اور ان کے بچوں کی کفالت کرتے رہے اس کے علاوہ وہ ہر مہینے اپنی تنخواہ سے ایک حصہ رکھ لیتے تھے اور گاؤں کے چند یتیم بچوں میں تقسیم کر دیتے تھے، یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا، صوم صلواۃ کے بے حد پابند تھے سخت غصے کی حالت میں بھی ہم نے ان کی زبان سے گالی کبھی نہیں سنی سچے اتنے کہ ۱۹۶۸ء میں جب ان کا پانچ سالہ کنٹریکٹ ختم ہوا اور ان سے پوچھا گیا کہ باقی صاحب آپکی اپنی عمر کتنی ہے تو انہوں نے کہدیا ۵۹ سال ان سے کہا گیا کہ آپ اپنی عمر ۵۵ سال لکھوادیں آپ کو پانچ سالہ کنٹریکٹ مل جائے گا کہنے لگے، رازق اللہ تعالےٰ ہے، ملازمت حاصل کرنے کے لئے جھوٹ نہیں بولوں گا، میری عمر جتنی ہے اتنی ہی لکھئے، چنانچہ باقی صاحب کو ایک سال کا کنٹریکٹ دیا گیا۔

ایک مرتبہ گاؤں کے ایک کھیت سے گزر رہے تھے کہ مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھالیا پھر کچھ سوچا اور اسے زور سے پھینک دیا، زمین کا مالک جو قریب ہی درخت کے نیچے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، فوراً اٹھا اور باقی

صاحب کے پاس پہنچ کر پوچھنے لگا کہ کیا بات ہے باقی صاحب سانپ تھا کیا؟ باقی صاحب نے کہا نہیں۔ انہوں نے پوچھا پھر آپ نے ڈھیلا اٹھا کر پھینکا کیوں کہنے لگے یہ ڈھیلا بہت صاف ستھرا تھا، استنجے کے لئے لے جانا چاہتا تھا مگر سوچا کہ مالک سے پوچھا نہیں اس کی اجازت کے بغیر مجھے یہ ڈھیلا نہیں لے جانا چاہیئے اس لئے پھینک دیا۔

آج وہ ہم میں موجود نہیں مگر وہ اپنے دوستوں کے دل میں اور اپنے کلام کے ان مجموعوں میں جو شائع ہو چکے ہیں، ہمیشہ زندہ رہیں گے ۸ر جنوری کو ان کا انتقال ہوا اور دس جنوری کو جب میں دفتر پہنچا تو میز پر ایک خط پڑا ملا، تحریر دیکھتے ہی بیساختہ میرے منہ سے نکلا، خدا جھوٹ نہ بلوائے، یہ تو باقی کا خط ہے، لفافہ چاک کیا، خط نکالا، لکھنے والے کا نام دیکھا اور اپنے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ ۸ر جنوری کو لکھا ہوا باقی صدیقی کا خط تھا، جو یقیناً ان کی آخری تحریر تھی۔

★★

عنایت اللہ

روپ
بہروپ



مجھے کہا گیا ہے کہ رحیم گل کی شخصیت کے کچھ پہلو پیش کروں۔

- رحیم گل پٹھان ہے
- سابق فوجی ہے
- فلمی دنیا کا آدمی ہے

میں اسے اور کیا کہوں۔

جب کسی کی شخصیت پر مضمون لکھا جاتا ہے تو یہ فقرے ضرور لکھے جاتے ہیں۔

"وہ بڑے مخلص، ملنسار اور ہر دل عزیز انسان تھے
صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ جب کھانا کھانے بیٹھتے
تو باہر جا کر دیکھتے کہ کوئی سوالی تو نہیں کھڑا؟
اپنے بچوں کو ہمیشہ یہی سبق دیتے کہ بچو ہمیشہ سچ بولو،
لالچ بری بلا ہے۔"

لیکن ایسے فقرے اس شخصیت کے لئے لکھے جاتے ہیں جو اس دنیا سے اٹھ گئی ہو۔ سچ پوچھئے تو اس قسم کے فقروں سے تو ہمارے وہ جواب

مضمون اچھے ہوتے ہیں جو ہم سکول میں گائے پر لکھا کرتے تھے۔ گائے کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ آگے سر اور پیچھے دم ہوتی ہے۔ گائے پالتو جانور ہے۔ گائے دودھ دیتی ہے۔ یہ جواب مضمون مجھے آج بھی اسلئے اچھا لگتا ہے کہ اس میں سچائی ہے۔ اس میں ایسا دروغ نہیں کہ گائے صوم صلوٰۃ کی پابند ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں جیتے جاگتے ادیب کی تعریف کرنے کا رواج نہیں البتہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر ہم اپنے ادب پاروں کی داد لینے کے لئے دوسروں کے ادب پاروں کی داد ضرور دیا کرتے ہیں اور جب کسی کا تازہ ناول چھپتا ہے تو ہم ٹائیٹل دیکھ کر ہی فیصلہ سنا دیتے ہیں کہ پلاٹ گھسا پٹا ہے کوئی خاص بات نہیں۔ دراصل ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ٹائیٹل پر رحیم گل کی جگہ عنایت اللہ چھپا ہوتا تو زیادہ اچھا لگتا۔ ایک دوسرے کی شخصیت کے اچھے پہلو بیان کرنا تو بعد کی بات ہے۔ ہم ایک دوسرے کی شخصیت کو تسلیم کرنے کے بھی قائل نہیں۔ ہاں کوئی ادیب مر جائے تو ہم اسکی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں اور یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ ادب کا ایک ستون گر پڑا ہے۔ مرحوم کیا مرا کہ ادب پر جمود طاری ہو گیا ہے حالانکہ ہمیں اچھی طرح یاد ہوتا ہے کہ جب مرحوم زندہ تھا تو ہم اسے ادیب ماننے پر بھی کبھی آمادہ نہیں ہوئے تھے۔

یہ فرض جو مجھے سونپا گیا ہے خاصا نازک ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکل گئی تو رحیم گل مارے گا۔ کوئی تعریفی جملہ نکل گیا تو میرے کئی بھائی ناراض ہوں گے کہ یہ اچھا ادیب ہے جو جیتے جاگتے ادیب کی تعریفیں کر رہا ہے بے چارے کو مر تو لینے دیا ہوتا۔

مجھے معلوم نہیں کہ آپ رحیم گل کو کس رنگ میں جانتے پہچانتے ہیں۔ میں تو اس کا وہ رنگ پیش کروں گا جو میں نے دیکھا ہے۔ میری زندگی میں ایک بہت ہی برا وقت آیا تھا۔ میں اوندھے منہ گر پڑا تھا۔ میری معاشرتی حیثیت اس حد تک مجروح ہو گئی تھی کہ میں خود اعتمادی اور سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا۔ ذاتی وقار کو سینے سے لگائے رکھنے کی بہت کوشش کی مگر پیٹ کے تقاضے غالب آ گئے۔ میرے پاس صرف دو چیزیں رہ گئیں تھیں۔ ہاتھ میں قلم اور ذہن میں یہ ٹیڑھا سوال کہ کیا قلم باعزت اور معقول ذریعہ معاش بن سکتا ہے؟ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ جو ادیب قلم سے روٹی کمانا چاہتا ہے وہ رائل پارک کا طواف کرتا یا ملتان روڈ پر جاتا نظر آتا ہے۔ ایک روز میں بھی زائرین کے اسی قافلے میں شامل ہو گیا اور رائل پارک پہنچ گیا۔ مجھے رحیم گل سے ملنا تھا۔ میں انہیں اس سے پہلے نہیں جانتا تھا۔ آغا بابر نے غائبانہ تعارف کرایا تھا۔ اس طرح رحیم گل سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔

میں نے مدعا بیان کیا اور کہا کہ میں لکھنے کے سوا اور کچھ نہیں جانتا اسی کو ذریعہ معاش بنانا چاہتا ہوں۔ ان دنوں رحیم گل اپنی ایک کہانی فلما رہے تھے۔ انہوں نے مجھے الگ بٹھا کر پوری دلچسپی سے میری بات سنی۔ ان دنوں میرے مضامین اور افسانے "لیل و نہار" "امروز" "ماہِ نو" "نقوش" اور "قندیل" میں شائع ہوا کرتے تھے۔ لیکن یہ دو وقت کی روٹی کے لئے کافی نہیں تھے۔ رحیم گل سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ مجھے غائبانہ طور پر جانتے ہیں اور میری تحریروں کے مداح بھی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے اس حادثے کی تفصیل بھی سنی جس نے مجھے رائل پارک تک پہنچایا تھا۔ رحیم گل نے پوچھا

"آپ نے فلمی دنیا میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے"؟

میں نے جواب دیا

"اس حادثے میں اس قدر بوکھلا گیا ہوں کہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی ہے میرے سامنے کوئی فیصلہ نہیں۔ کوئی پلان نہیں۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں ذریعہ معاش کی تلاش میں ہوں اور قلم کے سوا میرے پاس کوئی ہنر نہیں۔ میرا فوری مسئلہ اپنے چھوٹے سے کنبے کی باعزت روٹی ہے"۔

یہ حقیقت ہے کہ میرے پاؤں اکھڑ گئے تھے اور میں پرکاہ کی مانند آندھی میں اڑتا پھر رہا تھا۔

رحیم گل نے پوچھا "کبھی فلمی کہانی لکھی ہے"؟

میں نے کہا "کبھی نہیں لکھی۔ اگر آپ رہنمائی کریں تو میں لکھ لوں گا"۔

رحیم گل نے فلمی کہانیوں سے ہٹ کر میرے افسانوں وغیرہ کی تعریف اور تنقید کی۔ کچھ خامیاں بتائیں کچھ خوبیاں بتائیں۔ پھر انہوں نے عارضی سا انتظام کر دیا تاکہ کچھ عرصہ میرے گھر کی دال روٹی چلتی رہے۔ میں روزانہ رحیم گل سے ملتا۔ ان کا بتایا ہوا کام کرتا اور ہر روز ان سے کہتا کہ اپنی کسی فلمائی ہوئی کہانی کا مسودہ یا فلم سکرپٹ مجھے دکھا دیں تاکہ مجھے کچھ اندازہ ہو جائے کہ اس کی شکل وصورت کیسی ہوتی ہے مگر رحیم گل مجھے دوسری باتوں میں الجھا کر بات میرے ان افسانوں وغیرہ تک لے جاتے جو مختلف جرائد میں چھپتے

رہتے تھے۔ ان کی تنقید میں حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ جب کسی سے میرا تعارف کراتے ان الفاظ میں کراتے کہ یہ عنایت اللہ ہیں پائے کے ادیب ہیں۔

رحیم گل میرے گھر آنے لگے۔ ہماری دوستی گہری ہو گئی۔ میں ایسے بُرے حالات سے دوچار تھا جن سے گھبرا کر میرے دوست میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اس حقیقت کی تلخی کو قبول کر لیا تھا کہ میرا کوئی دوست نہیں اور مجھے خوشی بھی ہوتی کہ اب میرے گھر کوئی دوست نہیں آتا۔ میں پہلی سی خاطر تواضع کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ ان دگرگوں حالات میں رحیم گل میرے دوست بنے۔ گھر آتے تھے۔ زیادہ دیر شگفتہ باتیں کرتے۔ میں انہیں فلمی کہانیوں اور سکرپٹ کی طرف لاتا تو رحیم گل میرے افسانوں کو زیر بحث لے آتے درصل میرا دل افسانے، رپورتاژ اور مضامین لکھنے سے اچاٹ ہو گیا تھا کیوں کہ اس کھیت سے دہقان کو روزی میسر نہیں تھی۔ یہ رحیم گل تھے جنہوں نے مجھے ادبی دنیا سے لاتعلق نہ ہونے دیا اور فلمی دنیا میں مجھے آگے بڑھنے نہ دیا۔ ان کی انگیخت اور حوصلہ افزائی سے میں ادبی میدان میں موجود رہا اور رحیم گل کا دلایا ہوا کام کر کے دال روٹی چلاتا رہا۔ پھر ایک وقت آیا کہ میرے دل میں یہ ولولہ پیدا ہو گیا کہ رحیم گل شاید نہیں چاہتا کہ کوئی اور قلمکار فلمی دنیا میں آ کر کامیاب ہو جائے یہ غالباً کاروباری رقابت ہے لیکن دوسری طرف میں یہ دیکھتا تھا کہ رحیم گل واحد انسان ہے جسے میں مخلص دوست کہہ سکتا ہوں۔

پھر میری بے مائیگی کی پہلی عید آئی اور میرے گھر میں عید مبارک کہنے کو جو پہلا اور آخری فرد آیا وہ رحیم گل تھا۔ میں کچھ شرمسار ہوا کہ تہوار

کے مطابق میں خاطر تواضع کرنے کے قابل نہ تھا۔ رحیم گل نے یہ کہہ کر مجھے پریشان کر دیا کہ کھانا یہیں کھاؤں گا۔ میرے باورچی خانے میں عید کے روز بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ رحیم گل بیٹھے رہے۔ گپ شپ چلتی رہی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ آج صبح ہی سے میرے دل پر کچھ زیادہ ہی بوجھ تھا اور یہ بوجھ اتر گیا ہے۔ بے مایہ باپ کو بے مائیگی کا احساس عید کے روز زیادہ ہی ہوتا ہے رحیم گل سے گپ شپ چلتی رہی اور ہم نے کھانا بھی کھا لیا۔ کھانے کی سادگی کا احساس نہ رہا بلکہ میں نے سکون سا محسوس کیا اور جب رحیم گل دن کے پچھلے پہر چلے گئے تو میں نے سوچا کہ یہ شخص نہ آتا تو آج کا دن میری زندگی کا بڑا ہی تلخ اور بڑا ہی طویل دن ہوتا۔

پھر دوسری عید آئی۔ یہ بھی رحیم گل نے میرے گھر گزاری۔ میرے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا کہ میری ایک ذاتی حیثیت ہے جو زندہ ہے میری انفرادیت اور شخصیت مر نہیں گئی۔ رحیم گل نے ہی یہ احساس پیدا کیا تھا۔ ان کی گپ شپ اور حوصلہ افزا باتوں نے میری مجروح صلاحیتوں کو توانائی سی دے دی۔ مگر فلمی کہانیوں کی جب بھی بات ہوئی رحیم گل بات گول کر گئے اور میرے کسی افسانے کو زیر بحث لے آئے۔ اس طرح انہوں نے مجھ پر واضح کر دیا کہ مجھ میں ادب میں مقام پیدا کرنے کی بڑی صلاحیت ہے اور میں اس صلاحیت کو ابھاروں۔

رحیم گل حسن سلوک، شگفتہ اور حوصلہ افزا باتوں سے مجھے اس مقام تک لے آئے جہاں میری خود اعتمادی بحال ہو گئی اور میرا دماغ بہتر طریقے سے سوچنے کے قابل ہو گیا۔ میں نے اپنا میدان اور مقام پہچان لیا۔

اچھی طرح پہچان لیا اور پھر میری زندگی کا وہ دن طلوع ہوا جب میری ادبی تحریروں سے متاثر ہو کر ایک بہت بڑے ادارے نے بڑی ہی معقول پیشکش کی۔ ابتلا کا دور ختم ہو گیا۔ فلمی دنیا سے میرا تعلق ہمیشہ کے لئے ختم اور رحیم گل کے ساتھ تعلق اور گہرا ہو گیا۔ میرے معاشی مسائل حل ہو گئے۔ کھویا ہوا وقار بھی مل گیا۔ پھر صحافت نے مجھے اپنی طرف گھسیٹا اور آج سے تین سال پہلے میں نے نشر و اشاعت کا اپنا ادارہ قائم کیا اور اپنا پرچہ نکالا تو رحیم گل میرے دفتر میں آئے اسوقت ان کے چہرے پر اور آنکھوں پر جو چمک تھی وہ میری مسرت کی چمک تھی۔

رحیم گل نے کہا :۔

"میں تمہیں رائل پارک اور ملتان روڈ پر نہیں، یہاں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہاں کئی ادیب گم ہو گئے ہیں۔ وہ سونے کی اس کان میں اترے اور لاپتہ ہو گئے۔ تم معیاری فلمی کہانی اور سکرپٹ لکھ سکتے تھے لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ تم اس سے بہتر کام بھی کر سکتے ہو۔ میں نے تمہارا مقام پہچان لیا تھا اسی لئے میں نے تم سے کبھی فلمی کہانی کا مسودہ لکھایا تھا نہ فلم سکرپٹ"۔

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ رحیم گل نے مجھ پر سب سے بڑا احسان یہ کیا تھا کہ میری کھوئی ہوئی خود اعتمادی دے دی تھی اور میرا وقار بحال کر دیا تھا۔ رحیم گل فلمی دنیا کی ہنستی کھیلتی محفلوں کو چھوڑ کر میرے گھر کی اداس

اداس اور جد وجہد کی مشقت کی ماری ہوئی فضا میں کٹی کٹی گھنٹے گزارتے رہے۔ یہ احسان تھا، یہ ایثار تھا، یہ وصف اسی میں ہوتا ہے جس کی اپنی شخصیت مربوط اور مخلص ہو۔ یہ شخصیت رحیم گل کی ہے۔ مجھے افسوس کہ رحیم گل زندہ ہے ورنہ میں اس کی بہت تعریف کرتا ٭

★★

زیتون بانو



امیر حمزہ شنواری

امیر حمزہ شنواری پشتو ادب کی قد آور شخصیت ہیں انہوں نے زندگی بھر پشتو ادب و ثقافت کے لئے کام کیا ہے اور یہ کام ایسا بھی نہیں جسے بیک جنبش قلم رد کیا جا سکے۔ بلکہ انہوں نے پشتو شاعری کے چمن میں وہ پھول کھلائے ہیں جن کی خوشبو سے صوبہ سرحد کا گوشہ گوشہ مہک رہا ہے ان کی شاعری ان کی زندگی کی طرح رنگا رنگ ہے اور اس میں تصوف و مجاز کے ایسے ایسے گل بوٹے اپنی بہار دکھا رہے ہیں جن سے ادب کا طالب علم اپنی پیاس بھی بجھاتا ہے اور اس سے ذہنی اور فکری رہنمائی بھی حاصل کرتا ہے حمزہ صاحب کی زندگی گونا گوں تجربات کا مجموعہ ہے انہوں نے اس عرصۂ حیات میں جو کچھ بھی حاصل کیا ان تجربات کو اپنی شاعری اور نثر میں سمو دیا ہے جو ہمارے لئے اور ہماری آنے والی نسلوں کیلئے ایک ایسا قیمتی سرمایہ ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

اس سے پہلے کہ میں حمزہ صاحب کے بارے میں خود کچھ عرض کروں ان کے بارے میں رضا ہمدانی صاحب کی تحریر کا ایک ٹکڑا پیش کرتی ہوں یہ اقتباس ان کی کتاب "تذ ندر" کے اردو ایڈیشن کے دیباچے سے لیا گیا ہے یہ کتاب "انسان اور زندگی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے رضا صاحب پشاور کی ادبی

محفلوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حمزہ صاحب کا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔

"انہی دورِ کے ندیم کے تریاقیوں میں حمزہ خان شنواری بھی ہوتے وہ اپنے رفیقوں کے ساتھ اتنے گھل مل چکے تھے کہ جب کبھی وہ نہ آتے تو دائرہ ادبیہ میں ایک خلا سا محسوس ہوتا حمزہ خان اس محفل کے رکن رکین تصور کئے جاتے بلکہ بعض خصوصیات کی بنا پر ساری محفل میں امتیازی شان کے مالک تھے۔

وہ محفل میں سب سے زیادہ تقریر کرنے والوں میں سمجھے جاتے تھے وہ بے تکان بحثتے، فلسفے کے ساتھ انہیں زیادہ شغف تھا ان سے جو بھی بحثتا، فلسفے کی بھول بھلیوں میں پھنس کے رہ جاتا موضوع چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوتا بحث کا انداز فلسفیانہ ہوتا وہ بظاہر سخت قسم کے مذہبی معلوم ہوتے اور ان کی بحث بھی مذہبی قسم کی ہوتی مگر ذہناً چونکہ وہ فلسفی ہیں لہذا بحث کی ساری بنیاد فلسفے پر رکھتے اور ان کے استدلال کا منبع فلسفہ ہی ہوتا وہ عقیدتاً روایتی انداز کے صوفی اور وحدت الوجودی ہیں مگر بحث جب کرتے۔ تو اس کے اثبات کے لئے بھی فلسفے اور منطق کا سہارا لیتے۔ یہ بحث کا وہ پہلو ہوتا جو ان کے اپنے عقائد کے ساتھ تطبیق رکھتا اور وہ اس کے جواز میں دلائل لاتے لیکن بعض اوقات اپنے مقابل کو زچ کرنے کیلئے مابعد الطبیعیاتی ذہن رکھنے کے باوجود مضبوط سائنسی دلائل سے فریق مخالف کو لاجواب کر دیتے ایسی صورت میں وہ اس کی کبھی پرواہ نہ کرتے کہ بحث ان کے اپنے عقائد کا رد کر رہی ہے تاہم یہ بحث برائے بحث ہی ہوتی یہ بات آج بھی قائم ہے آج بھی جب نفی ذات پر کسی کے ساتھ الجھ پڑیں تو نفی کے ثبوت میں بڑے شد و مد کے ساتھ ایسے دلائل پیش کرتے ہیں کہ ان پر ملحد کا گمان ہونے لگتا ہے حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے اسی رجحان

طبع کے پیش نظر محفل میں انہیں متشکک کہا جاتا ہے لیکن میں نے اس سلسلے میں اپنے احباب کے ساتھ کبھی اتفاق نہیں کیا میری دانست میں حمزہ خاں متشکک کم اور وسیع المشرب زیادہ ہیں وہ چونکہ دراک ذہن رکھتے ہیں اور کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے اچھی طرح اس کی چھان پھٹک کر لیتے ہیں۔ اور اطمینانِ کلی کے بعد ان کی طبیعت قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حمزہ خاں متشکک نہیں بلکہ محقق ہیں تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان کا رابطہ اور رشتہ قلبی ہے اور اس کے وسیلے وہ بڑی کڑی منزلیں طے کر لیتے ہیں:

حمزہ خاں کی علمیت کا تعارف اس سے بہتر انداز میں کم از کم میں نہیں کرا سکتی تھی رضا صاحب نے میری بہت بڑی مشکل حل کر دی ہے ان کے اس اقتباس سے حمزہ صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کا آپ کو بھی اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی حمزہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں مرد اور عورت کی بحث میں جگہ جگہ عورت کو کمزور اور ناقص العقل ثابت کیا ہے وہ ارسطو کے اس مقولے کے ہمنوا ہیں۔

"مرد آقا ہے اور عورت خادمہ، عورت کی قوتِ ارادی کمزور ہے اور وہ کردار کے سلسلے میں قوی نہیں۔ اس کے لئے گھر کے انتظامی امور سب سے بہتر ہیں ضروری ہے کہ خارجی معاملات میں عورت مرد کے تابع رہے اور خانگی معاملات میں مرد کو عورت کے تابع رہنا چاہیئے عورتوں کو چاہیئے کہ وہ مردوں کی نقل نہ اتاریں اور یہی افلاطون کی جمہوریت میں بھی لکھا ہے:"

میں اس وقت عورت ہونے کے ناطے سے حمزہ صاحب کی کسی رائے کی تردید کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی اس لئے کہ ان کی اس رائے کا جواب رضا صاحب نے بڑے خوبصورت انداز میں دیا ہے میں یہاں صرف اتنا عرض کروں گی کہ حمزہ صاحب نے اپنی علمیت سے جہاں پشتونوں کے لئے پشتو ادب کے ذخیرے میں اضافہ کیا ہے وہاں انہیں چاہیے تھا کہ وہ پشتونوں کو یہ مشورہ بھی دیتے کہ انہوں نے خواتین کو بیکار محض کیوں سمجھ رکھا ہے دیکھا جائے تو پشتونوں کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی ان کا عورتوں کے ساتھ یہ متعصبانہ رویہ ہے اور اس کے قصور وار وہ خود ہی ہیں اب جبکہ علم و فضل کا چرچا ہے اور پشتونوں نے خواتین کو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے میں بخل برتنا چھوڑ دیا ہے اس کے باوجود بھی وہ خواتین کو ایسے اداروں میں حصہ لینے نہیں دیتے جن میں مردوں کا عمل دخل ہے حالانکہ ہمارے ان بہادر اور غیور پشتونوں میں ایسے قبیلے اب بھی موجود ہیں جہاں مرد تمام دن ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں اور ان کی بیویاں تمام دن ان کے گھر بار کا کام خود اپنے ہاتھوں انجام دیتی ہیں اور وہ صرف گھر کا چولہا ہی نہیں چلاتیں بلکہ کھیت کھلیان کو بھی سنبھالتی ہیں اور ان کے مردوں کی مردانگی کا زیور بندوق ان کے گلے کی زینت بنا ان کا سر چڑھاتا رہتا ہے۔

مجھے حمزہ صاحب کی جو بات پسند ہے وہ ہے ان کا رویہ۔ ان کا رویہ بڑوں چھوٹوں کے ساتھ یکساں ہے جس طرح وہ اپنے ہمعصروں سے ملتے ہیں اسی طرح وہ آج کی نوجوان نسل سے بھی ملتے ہیں اور ان کی گفتگو کی حلاوت اور بے تکلف انداز ہر ایک کا دل موہ لیتا ہے ان کی شخصیت ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنا

لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے پیٹھ پیچھے بھی ان کی کوئی برائی نہیں کرتا۔

میں ویسے تو حمزہ صاحب کے فن سے ایک مدت سے آشنا ہوں۔ لیکن ان سے ملاقات میری اس زمانے میں ہوئی جب میں ریڈیو پاکستان پشاور میں بطور پروڈیوسر شامل ہوئی تھی ریڈیو کے لئے حمزہ صاحب ایک عرصہ سے لکھ رہے ہیں انہوں نے اپنی ہر تحریر میں اپنا معیار قائم رکھا ہے۔ آج کل کے ادیبوں کی طرح انہوں نے سہل پسندی سے کام نہیں لیا۔ چنانچہ ان کے ڈرامے "پن چکی" کے مقابلے کا ڈراما اب تک کوئی اور نہیں لکھ سکا نئے ادیبوں کو ان کی اپنی سہل پسندی نے ڈوبی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں سب سے بڑا ہاتھ ادیب کی معاشی ضرورتوں کا ہے پھر جب میں آج کے بیشتر ادیبوں کو آسودہ حال دیکھتی ہوں تو میرا خیال ریت کی دیوار بن جاتا ہے اور میری سوچ کا دھارا ان میں چھپی ہوئی حرص پہ آکر ٹھہر جاتا ہے تب میں سوچتی ہوں کہ ادیب اور شاعر تو ہمارے معاشرے کا ایک ایسا فرد ہے جو انسانوں کے دلوں میں زندگی کی شمع روشن رکھنے کے ساتھ انہیں جہد حیات پہ گامزن ہونے کا درس بھی دیتا ہے وہ اگر جلب زر کا شکار ہو جائے گا تو اس کی سوچ و فکر کے دھارے خشک ہونے لگیں گے اس کا مقصد یہ نہیں کہ مجھے تباہ حال پریشان اور غموں سے نڈھال ادیب اچھے لگتے ہیں یا وہی صرف معیاری ادب تخلیق کرنے پر قدرت رکھتے ہیں بلکہ میری اس سوچ میں ایک ایسا مثالی ادیب لبا ہُوا ہے جو ناتے تو نہیں کرتا لیکن اپنے فن سے پیار ضرور کرتا ہے مغربی ممالک میں ادیب بہت زیادہ آسودہ حال ہیں لیکن وہ ہمارے ادیبوں کی طرح فن دشمن نہیں انہیں اپنے فن سے والہانہ محبت ہے ان کی تحریر کا ہر

جملہ ان کے دلی جذبات اور گہرے مشاہدات کا منہ بولتا آئینہ ہوتا ہے آپ ان کی ہر تحریر کو ٹھوک بجا کر دیکھ سکتے ہیں لیکن جب میں نئی نسل کی تحریریں دیکھتی ہوں تو میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

بات حمزہ صاحب کی ہو رہی تھی میری ملازمت کے زمانے میں حمزہ صاحب نے ریڈیو کے لئے ایک ڈراما لکھ کے بھجوایا تھا اتفاق سے انہی دنوں ریڈیو میں ہمیں ایک کمپین چلانے کا حکم ملا تھا۔ جب میں نے شیڈول مرتب کرنا شروع کیا تو میرے پروگرام آرگنائزر عمر ناصر صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں اس کمپین کے لئے حمزہ صاحب سے دوسرا ڈراما لکھوالوں میں نے ان کو جواباً یہ بتایا کہ حمزہ صاحب سے جلد رابطہ قائم کرنا مشکل ہے اس لئے اس ڈرامے میں تھوڑا سا ردّوبدل خود ہی کر لوں گی یہ سن کر انھوں نے مجھے سمجھایا کہ حمزہ صاحب اپنی تحریر میں کسی قسم کی ترمیم مناسب نہیں سمجھتے لہٰذا خواہ مخواہ کا جھگڑا مول لینے کی ضرورت نہیں ناصر صاحب کی بات گرہ میں باندھ لینے کے بعد میں اپنی ضد پر اڑی رہی نجانے کونسی طاقت تھی جو مجھے ان کے ڈرامے میں ردّوبدل کرنے پر اکسا رہی تھی اس میں یا تو حمزہ صاحب کے حلیم رویّے کا دخل تھا یا پھر مجھے اپنے اوپر بہت زیادہ اعتماد تھا اور ہوا وہی جو میں کرنا چاہتی تھی میں نے جب ڈرامے میں مناسب ترمیم کر کے ناصر صاحب کو دکھایا وہ میری ترمیم سے خوش تو ہوئے لیکن پھر بھی وہ کچھ گھبرائے گھبرائے سے تھے اسی دوران میں میں نے اپنا کام جاری رکھا اور ڈرامے کو منظور کروالیا ایک روز حمزہ صاحب کسی کام سے تشریف لے آئے جب وہ ہمارے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنی باتوں کے پھول کھلا رہے تھے۔ سب ان کی حلاوت میں ڈوبی گفتگو میں غرق تھے کہ ناصر صاحب نے شرارتاً کہا۔

" حمزہ صاحب آپ کے ڈرامے میں تو بانو نے ترمیم کی ہے " حمزہ صاحب یہ سن کر مسکرائے پھر میری طرف دیکھا میں سانس روکے ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ انہوں نے لب کھولے " اچھا اگر ترمیم بانو نے کی ہے تو ٹھیک ہی ہوگی " ان کے جانے کے بعد ناصر صاحب نے پھر اپنی بات کو دہرایا " اری پگلی مسکرانا تو حمزہ صاحب کی عادت ہے تم دیکھنا وہ یقیناً اس بات پر ہم سے ناراض ہو کر گئے ہیں " لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے بعد بھی ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی وہ جب بھی ملے اسی محبت اور خلوص سے ملے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی ریڈیو کی ملازمت کے دوران پیش آچکا ہے ہوا یوں کہ میں نے حمزہ صاحب کا ایک پرانا ڈراما " کور محلت " خواتین کے پروگرام کے لئے شیڈول کیا اس ڈرامے کا مسودہ بلکہ نقل شدہ کاپیاں تک ہماری لائبریری میں موجود تھیں ڈرامے میں تین چار عورتوں کی لڑائی بڑے ہی پیارے انداز میں بیان کی گئی ہے چونکہ اس ڈرامے میں کئی بار میں بطور آرٹسٹ بھی حصہ لے چکی تھی لہٰذا یہ ڈراما مع اسکے کرداروں کے مجھے کچھ کچھ یاد تھا اس یادداشت پر بھروسہ کر کے میں نے آرٹسٹوں کی بکنگ کر لی جب ڈرامے کی ریکارڈنگ کے دن قریب آئے اور میں نے ڈرامے کا مسودہ طلب کیا تو پتہ چلا کہ لائبریری میں اس نام کا کوئی ڈراما سرے سے موجود ہی نہیں ہے ریڈیو کے زمانے میں میرے نشیتو ن اور غیرتی بھائیوں نے جو منہ پر تو میرے بڑے ہمدرد بنتے تھے لیکن دل میں میری کامیابیوں پر جلتے بھنتے رہتے تھے اور اس سلسلے میں ان سے اور تو کچھ ہو نہیں سکتا تھا وہ مجھے پریشان کرنے کے لئے میرے مسودات غائب کر دیتے تھے چنانچہ ایک بار میں نے قائد اعظم کی ولادت کے موقع پر بچوں کے پروگرام کے تمام

مسودات کی فائل ایک روز قبل ڈیوٹی روم میں جمع کرائی دوسرے دن صبح جب میں پروگرام پیش کرنے کے لئے سٹیشن پہنچی تو ڈیوٹی روم سے وہ فائل ہی غائب تھی اس کے باوجود میں ذرا بھی نہ گھبرائی بلکہ جب کسی نے پوچھا کہ کیا ہوگا تو میرا جواب یہ تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں پندرہ بیس منٹ تک تو میں خود بھی قائداعظم کے بارے میں زبانی گفتگو کر سکتی ہوں بعد میں وہ فائل پروگرام شروع ہونے سے صرف دو منٹ قبل مل گئی جو کسی نے شرارت سے ڈیوٹی روم کی الماری کے اوپر پھینک دی تھی اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ پشتونوں کی غیرت یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ ایک پشتون عورت جسے وہ ناقص العقل سمجھتے ہیں ان کی مدمقابل بن جائے اور وہ کام کرے جو صرف وہی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں بات ہو رہی تھی حمزہ صاحب کے ڈرامے کے مسودے کی تو صاحبو وہ مسودہ نہ ملنا تھا نہ ملا اور اب اتنا وقت نہیں تھا کہ دوسرا ڈراما لکھوایا جاتا اس ڈرامے کی گمشدگی پر میں اپنے آپ کو نااہل ثابت کرنا بھی نہیں چاہتی تھی پھر میرے پروگرام آرگنائزر ارباب عبدالودود صاحب تھے ان کے کان میں اگر مسودے کی گمشدگی کی بھنک پڑ جاتی تو وہ اور بھی بگڑتے اور اپنے افسر کی ناراضگی مجھے کسی صورت بھی منظور نہیں تھی لہٰذا میں نے گھبرا کر اللہ کا نام لیا اور بیٹھ کے ڈراما لکھنا شروع کیا صبح جب میں ڈیوٹی پر گئی تو میرے ہاتھ میں حمزہ صاحب کے ڈرامے "کور محلت" کا مسودہ بھی تھا مجھے یہ ڈراما لکھنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی چنانچہ میں نے ڈرامے کی کاپیاں تیار کروا کے اسکی ریہرسل شروع کر دی اتفاق دیکھئے کہ اس کے کرداروں میں تقریباً وہی خواتین شامل تھیں جو اس سے قبل بھی اس ڈرامے میں حصہ لے چکی تھیں ڈرامے کا مسودہ پڑھنے کے بعد کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ یہ

مسودہ میں نے لکھا ہے البتہ جس دن ریکارڈنگ ہو رہی تھی اس دن مجھے ایک ڈراما آرٹسٹ اختری بیگم نے صرف اتنا بتایا کہ حمزہ صاحب کے اس ڈرامے میں تو ایک مرد کا کردار بھی تھا جوان جھگڑا لو خواتین میں صلح صفائی کرواتے آتا ہے لیکن میں نے اس کام کے لئے ایک خاتون کا کردار بڑھا دیا تھا

جب اختری بیگم نے مجھے یاد دلایا تو یہ بات میرے ذہن میں آئی لیکن اس وقت اسے تبدیل کرنا مشکل تھا اور وہ ڈراما جیسا میں نے لکھا تھا ویسا ہی نشر ہوا اور آج تک ریڈیو کے کسی شخص کو یہ پتہ تک نہیں ہوا کہ وہ ڈراما جو حمزہ صاحب کے نام سے نشر ہوا تھا وہ ان کا نہیں تھا اور آج میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے بڑا فخر محسوس کر رہی ہوں اور مجھے حمزہ صاحب سے امید ہے کہ وہ مجھے میری اس جسارت پر بھی اسی طرح معاف کر دیں گے جس طرح انہوں نے پہلے ایک بار میری گستاخی معاف کر دی تھی ان کی اس دریا دلی کی میں کیا سبھی معترف ہیں۔

★ ★

جمیلہ ہاشمی کے افسانے



— اختر جمال

فقیر نے کسی بھی موڈ میں مشورہ دیا ہو کتاب کھولی خیال ہوا کہ غالباً آپ سب کا بیڑا ہوتے دیکھیں گے۔ مگر کتاب پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ جمیلہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ لیکن وہ "بیڑا" کسی کا نہیں کرنا چاہتی ہیں اس لئے کہ کوئی فنکار کسی فنکار کا "بیڑا" کر ہی نہیں سکتا۔ عروس فن کا سنگھار سب مل کر کرتے ہیں۔ مگر کون یہ دعوئی کر سکتا ہے کہ اس نے حق ادا کر دیا۔ یہی محسوس ہوتا ہے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ وہ اپنے آپ سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا خوب سے خوب تر کی تلاش اپنی ذات کی نفی پر مجبور کرتی ہے۔ جانور کی حالت سے آدمی کی حالت اور آدمی سے فرشتہ اور فرشتہ سے خدا ——— ! اس لمبے سفر میں جس شان استغنا اور بے نیازی سے فنکار اقبال کے الفاظ میں "تخلیق میں خالق کا ہمسر بننے کی کوشش کرتا ہے اسی لحاظ سے اس کے فن میں زندہ رہنے کی قوت اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔

اپنا اپنا جہنم پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ اس کتاب کی مصنفہ نے تلاش بہاراں والی جمیلہ ہاشمی کا "بیڑا" کر دیا ہے اپنا اپنا جہنم کی جمیلہ

تلاش بہاراں کی جمیلہ سے بہت آگے ہے اور "آتش سرفتہ" کی جمیلہ کے ساتھ ساتھ ہے۔ مجھے جمیلہ کی سب تحریروں میں آتش سرفتہ زیادہ پسند ہے جمیلہ کو بحیثیت ایک فنکار کے میں نے پہلی مرتبہ "آتش سرفتہ" میں ہی دریافت کیا تھا۔

"دادی نے جو کہانی سنائی اس میں راجہ نہ تھا۔ کوئی رانی تھی پرانوپ سنگھ کو بھا گو بہت اچھی لگتی تھی اور پھر وہ اس کی کچھ نہ تھی۔ رانی ہونا بڑی بات ہے وہ تو تمہارے گھروں میں کام کرنے والی کہاری تھی۔ آج مجھے معلوم ہے کہ اچھا لگنے کے لئے آنکھوں کی سیاہی اور رانیوں جیسی چال کچھ نہیں کرتی جو عورت اچھی لگنے لگے اس میں ساری باتیں آپ سے آپ پیدا ہو جاتی ہیں"۔ انوپ سنگھ جو بات عورت کے متعلق سوچتا ہے وہی بات ایک کتاب کے متعلق بھی صحیح ہے جو کتاب اچھی لگنے لگے اس میں ساری خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں اور جو مصنف جتنا اچھا لگے اس کے متعلق یہ بتانا کہ اس میں کیا خوبیاں ہیں اتنا ہی مشکل بن جاتا ہے اور اگر دوست ہو تو پھر فنکار اور دوست دو شخصیتیں سامنے آتی ہیں۔ اور فنکار کی تعریف کرنے کو جی بھی چاہیے تو دوست کی تعریف اپنی تعریف معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس صورت حال میں خاموشی ہی مناسب ہوتی ہے۔ مگر میرے سامنے آج یہ آزمائش ہے کہ دوست سے نظریں چرا کر فنکار سے نظر ملائی جا سکتی ہے یا نہیں۔؟

فن اور شخصیت کا گہرا رشتہ ہے ہر فن کار کی زندگی سوچ تجربے اور احساس کی سچی نمائندگی اسکا فن کرتا ہے۔ جمیلہ کی شخصیت

بھی ایک ساے دار تناور درخت کی طرح اپنے اپنے جہنم میں جلنے والے سب کرداروں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ جمیلہ کی کہانیوں کی عورت ایک سیدھی سادھی عورت ہے۔ خالص زمینی جس کی سوچیں آرزوئیں خواب سب کچھ جیتے جاگتے ہیں۔ جمیلہ کی کہانیوں میں جس مرد کا ہیولیٰ ہیرو کی حیثیت سے ابھرتا ہے وہ بھی زمین کی مخلوق ہے وہ عورت اور دھرتی سے یکساں پیار کرتا ہے۔ "دُھی" میں وہ نرم اور گرم جذبوں کی آنچ میں سلگتا نظر آتا ہے طاقتور ہو کر بھی کمزور مالک بن کر بے بس اس کی جیت اس کی ہار بن جاتی ہے۔ گوتم اور مرلی بھی ایک جیسے مجبور اور بے بس کیدار ناتھ اس لئے پوجا کرتے ہیں کہ "تمہیں پوجنا مجھے خوشی دیتا ہے" وہ بے بسی سے پھول کی تازگی اور اس کی باس کو ٹہنی پر لگے لگے ختم ہوتے دیکھتے ہیں۔ مگر کچھ نہیں کر سکتے۔

جمیلہ بنیادی طور پر ایک ناول نگار ہیں۔ انہوں نے ناولٹ زیادہ لکھے ہیں اور مختصر کہانیاں کم لکھی ہیں۔ مختصر افسانہ اور ناولٹ قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت دور ہوتے ہیں۔ مختصر افسانے میں فنکار کا جادو احساس اور جذبہ کی شدت سے ایک بھرپور کلائمکس کی صورت میں اپنی گرفت میں لیتا ہے اس کے برعکس ناولٹ میں ناول کی طرح زندگی آہستہ آہستہ بہتے ہوئے دریا کی صورت گذرتی ہے آپ چہل قدمی کرتے ہوئے سکون سے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں ارد گرد کی فضا اتنی جانی پہچانی لگتی ہے۔ جیسے آپ کے پڑوسی ہیں ان کی جزئیات ان کے جذبے ان کی بحثیں ان کی گھٹن۔ انہیں چونکا دینے

والی کوئی بات نظر نہیں آتی وہ اپنی الجھنوں کے جال میں گرفتار اور اپنی محرومیوں کے لیے ہمدردی کے طالب نظر آتے ہیں۔ مگر جانے کیوں ان سے زیادہ ہمدردی بھی محسوس نہیں ہوتی اس لئے کہ اپنی زندگی کو بدلنے کی شدید خواہش خود انہیں بھی نظر نہیں آتی انہیں تو اس زندگی سے بیزاری کا احساس بھی نہیں ہے۔

جمیلہ کے پاس ایک اچھے فوٹوگرافر کا کیمرہ بھی ہے اور فن بھی وہ ہر زاویئے سے تصویریں کھینچنے میں ماہر ہیں اور محنت کر کے چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بھی دکھاتی ہیں۔ کوئی بات ان سے ڈھکی چھپی نہیں اور نہ ہی وہ دوسروں سے چھپانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس لئے تجسس اور تلاش کا جذبہ نہیں ابھرتا بلکہ ایک کے بعد ایک سب پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ آخر میں ایک ترحم آمیز جذبے سے ہم اپنے جہنم میں سلگتے اور جلتے لوگوں کو بے چارگی سے دیکھتے ہیں۔ مگر یہ وہ جہنم بھی نہیں جہاں ہل من مزید کی صدا اٹھے اس جہنم میں جلنے والے دھیرے دھیرے اپنی آگ خود ہی بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ تڑپنے اور بھڑکنے میں بھی زیادہ مزا نہیں لیتے اور اپنے اپنے شرر او ربھڑکانے کے بجائے چپکے چپکے راکھ ڈالتے رہتے ہیں اور پھر پڑھنے والے کو ایسا لگتا ہے کہ آگ خود بخود سرد ہو جائے گی۔ اور ان سب کی آگ زیادہ تر جسم کی آگ ہے۔

جمیلہ کا سب سے زیادہ پسندیدہ موضوع جنس ہے جس کے بارے میں وہ اپنے کرداروں کے ذریعہ خوبصورتی اور بے تکلفی سے

اظہار رائے کرتی ہیں۔ لیکن جنس زندگی کے بہت سے مسائل میں سے
صرف ایک مسئلہ ہے بہت سے موضوعات میں سے صرف ایک موضوع
ساری زندگی ہے نہ ساری زندگی پر محیط ہے۔ جمیلہ کی کہانیوں میں
یہ موضوع سب سے زیادہ اہم بن کر سامنے آتا ہے۔ یہاں تک کہ جنس
سے ہٹ کر جب وہ اردگرد کے موضوع پر نظر ڈالتی ہیں تو بھی پس منظر
میں بہر حال وہی فضا رہتی ہے۔ دوسری کہانی میں طالب علموں کی
جدوجہد اور سیاسی زندگی نظر آتی ہے۔ مگر یہ تحریک موضوع نہیں
بنتی۔ موضوع جنسی گھٹن ہے تارا اور مایا دونوں جنسی محرومی اور گھٹن
کا شکار ہیں۔ تارا پیاسی رہتی ہے مایا پیاس بجھانا جانتی ہے مگر پھر بھی
پیاسی ہے۔ ہمارے معاشرے میں جہاں ایک خاص طبقہ میں عورت
کو کوئی کام نہیں ہے، اور وہ صرف اپنا جسم رکھتی ہے۔ اور اس کا بوجھ
بھی اس سے نہیں سنبھلتا مایا جیسا کردار اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ اس
عورت کا علاج ہے کہ اس کی غذا ختم کر کے اس سے فاقہ کشی کرائی جائے
اور کسی کام میں لگایا جائے تاکہ یہ اپنے جسم کے علاوہ کچھ اور سوچے اور
ہوس کی آگ بجھ جائے۔ مایا کی پیاس لاعلاج نظر آتی ہے "مایا نے بڑی
دلنوازی سے اپنا سر میرے کندھے پر رکھا اس کے جسم سے تیز بو نکل
رہی تھی، میں نے اسے ہاتھ لگایا تو اس کا گوشت میرے ہاتھوں سے لگ
گیا۔ جو تارکول کے رنگ کا تھا۔ میں نے اسے دھویا، چھڑانے کی کوشش کی
مگر وہ بو مجھے پاگل کئے دیتی تھی۔ اور میرا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ مایا کی
آنکھوں میں ہنسی تھی۔ مگر اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے"

اس جہنم کی بیشتر عورتیں اس ہون کنڈ میں جلتی ہیں۔ اور اپنی بیتی یادوں کے ساتھ اکیلی ہیں۔ اور ان کے سامنے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ گوتم کی طرح زندگی میں آدمی کندھا اچکا کر یہی کہتا ہے اور "میں کسی کی تباہی میں شریک نہیں تھا"

دوسری کہانی میں جب کیدار ہولے سے پوچھتا ہے کہ تارا میں کچھ پوچھنے آیا ہوں۔ تو تارا جواب دیتی ہے کہ میرے خیال میں تو اب کچھ کہنے اور سننے کو باقی نہیں رہا۔" لیکن اس مکالمے کے باوجود جب وہ فائلیں لیکر روش کے باہر جاتا ہے تو ہمیں تارا کی گھٹی ہوئی روح کی فریاد سنائی دیتی ہے "میں اپنے خوابوں کو پیچھے چھوڑ کر تمہاری پکار سنتی ہوں۔ میں آتی ہوں"

دھیمے دھیمے سلگتے ہوئے جذبوں کی آنچ محسوس کرانا ہی جمیلہ کا فن ہے۔ ان کے کرداروں میں تیزی اور طراری نہیں ہے۔ نہ وہ کسی موڑ پر حیران کرتے ہیں "ہم ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ نہ ان کے پیچھے دیوانہ وار دوڑنے کو جی چاہتا ہے اور نہ ہی ان کی کوئی چوٹ اتنی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ ہم مضطرب ہو جائیں۔ بس ہم چپکے چپکے دھیرے دھیرے دوستی کا ایک جذبہ محسوس کرتے ہیں۔

مارجری جمیلہ کے کرداروں میں منفرد ہے اور ایک سامراجی ایجنٹ کا مکمل اور کامیاب نمائندہ کردار ہے استحصالی ملکوں میں سامراج جہاں اور سب ذرائع استحصال کے استعمال کرتا ہے۔ وہاں گوری چمڑی کی یہ عورت بھی ایک نمائندہ ہے وہ اپنا فرض ادا کرتی ہے۔ سب کو اپنے جسم کے دادو سے خرید لیتی ہے اپنا مطلب پوری طرح حاصل کر لیتی ہے

شریے مغرب کی نئی نسل کی نمائندہ ہے جو اپنے ماحول میں ضمیر کی آواز اور احساس سے اپنے وجود کی صداقت کو منوا رہی ہے۔ شریے کے کردار میں مغرب کی اس نئی نسل کا یہ انقلابی شعور تو نہیں جھلکتا مگر بہر حال اسے اپنے ضمیر کی آواز کا احساس ضرور ہے۔ یہ نسل اپنی اپنی میراث سامراجیت سے استحصال اور استعمار کی تحریکوں سے بیزار ہے اور انقلابی جدوجہد میں شریک ہے۔

ہم ایک استحصالی معاشرے میں رہتے ہیں۔ جہاں طبقے میں بہت سے تضاد ہیں۔ ظالم اور مظلوم الگ الگ ہیں اور ظلم کی نشاندہی کرنا ایک فنکار کا فرض ہے مثبت اور منفی قدروں کی اس آویزش میں سب چیزیں گڈمڈ نظر آتی ہیں۔ انہیں الگ الگ کرنا اور ان کا تجزیہ کرنا بھی فنکار کا کام ہے۔ یہاں محبت چھپ جاتی ہے اور ہوس کی حکمرانی ہوتی ہے، بیوپار جسم کا ہی نہیں ہر شے کا ہوتا ہے۔ فن کا بھی ہوتا ہے۔ اگر اثر و رسوخ عہدہ اور دولت ہے تو شہرت بھی خریدی جا سکتی ہے اس لئے فنکار کو ایسے معاشرے میں اپنے لئے کانٹوں بھرا راستہ منتخب کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ قدم قدم پر اقدار کا نام لے کر اقدار کی نفی کی جاتی ہے جھوٹ دلنشین اور خوبصورت بن کر سامنے آتا ہے اور ایسے میں صرف سچ کا نشتر ہی فنکار کا ہتھیار ہوتا ہے۔ جنس کو اگر دوسرے مسائل کے مقابلہ میں اہمیت دی جاتی تو پھر وہ دوسرے مسائل جن پر ہماری موت و حیات کا دارو مدار ہے پس پشت رہ جاتے ہیں۔ اس لئے جنسی حقیقت نگاری کو

موضوع بناتے وقت بھی ان عرکات کی نشاندہی ضروری ہے جن کی وجہ سے جنسی محرومی اور جنسی کجروی پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کی سب محرومیوں کی وجہ ناانصافی ہے اور سارے مسائل ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس لئے سماجی حقیقت پسندی کی راہ اختیار کر کے طبقہ دارانہ سماج اور سیاست کو سمجھ کر ہی روشنی دکھائی جا سکتی ہے۔ اور ادب روشنی ہے۔!

جمیلہ کو خوش قسمتی سے یہ مواقع حاصل ہیں کہ وہ دیہاتی ماحول قریب سے دیکھ سکتی ہیں۔ انہیں اس ماحول کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنانا چاہیئے۔ دیہاتیوں کے ان گنت مسائل ہیں۔ اور یہ سیدھے سادے محنت کش لوگ زندہ توانا اور سچا عشق کرتے ہیں۔ رزق حلال اور محنت سے رگوں میں جب خون کی گردش ہوتی ہے تو خودی عزت اور آن کا نام محبت ہوتا ہے۔ پنجاب کی سرزمین ہوس کی آگ میں جلنے والی مایا کی نہیں سوہنی اور ہیر کی سرزمین ہے۔ جن کی محبت سچی تھی جن کے جذبے سچے تھے وہ لوگ جو محبت کی آن پر مرمٹے یا پھر پنجاب کی ترجمانی وہ کسان عورت کرتی ہے جو بلھے شاہ کے لفظوں میں یہ گاتی سناتی دیتی ہے۔

بھانویں جان نہ جان وے ویہڑے آوڑ میرے
میں تیرے قربان وے ویہڑے آوڑ میرے
تیرے جہیا مینوں ہور نہ کوئی

ڈھونڈاں جنگل بیلا روہی

فنکار جب دنیا کی بھیڑ میں اپنے وجود کو گم کر دیتا ہے تو وہ سب کے انگارے اپنی جھولی میں بھر لیتا ہے اور پھول سب کو بانٹ دیتا ہے ”اپنا اپنا جہنم“ کی ہلکی ہلکی آنچ میں بھی پھولوں کی بھینی بھینی مہک ہے۔

★ ★



رشیدہ رضویہ

منفرد ادیبہ

انور عنایت اللہ

ضدی بچوں سے آپ کو زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور واسطہ پڑا ہو گا کسی بات کے لئے منع کرو تو وہ ضرور کرتے ہیں اس وقت تک کرتے ہیں جب تک انہیں ٹوکنا نہ چھوڑ دیں میں نے جب بھی اردو کی مشہور ادیبہ رشیدہ رضویہ کے بارے میں سوچا ہے مجھے ضدی بچے ہی یاد آتے ہیں اسکی بڑی معقول وجہ ہے۔

آج سے تقریباً تیرہ سال پہلے میرے پاس ایک کتاب تبصرے کے لئے آئی اس کا نام تھا "کھنڈر کھنڈر بابل بابل" افسانوں کے اس مجموعے کا نام بڑا منفرد تھا اور اس کی مصنفہ تھیں رشیدہ رضویہ جن کی کہانیاں میں ساقی اور ایک آدھ دوسرے ادبی رسالے میں پڑھ چکا تھا۔ اس زمانے میں میں باقاعدگی سے "ڈان" اور "مارننگ نیوز" میں کتابوں پر تبصرے کیا کرتا تھا رشیدہ رضویہ کی کتاب اسی سلسلے میں میرے پاس آئی تھی۔ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے ابھی میں نے اس مجموعے کی ایک ہی کہانی پڑھی تھی کہ اردو کے ایک روزنامے میں اس پر تبصرہ شائع ہو گیا جس نے مجھے چونکا دیا اسکی پہلی وجہ تو اس کا لہجہ تھا جس میں خلوص کا فقدان تھا اور

تلخی ہی تلخی تھی دوسرے فاضل تبصرہ نگار نے بعض ایسے خیالات کا اظہار فرمایا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جدید افسانے کی تیکنیک سے ناواقف ہیں اور انہوں نے روایتی انداز سے لکھے ہوئے افسانوں کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھا تھا رشیدہ رضویہ کے یہاں تو شروع ہی سے روایتی انداز سے بغاوت نمایاں تھی بھلا ان کے افسانوں کا یہ پہلو تبصرہ نگاروں کی سمجھ میں کیسے آتا میں نے اس کے بعد دل لگا کر "کھنڈر کھنڈر بابل بابل" کے تمام افسانے پڑھ ڈالے اور ان کا جو پہلو مجھے سب سے زیادہ پسند آیا وہ انکی منفرد طرزِ تحریر تھی جو عام آدمی کے لئے مبہم ہو تو ہو لیکن ان کے لئے جو تاریخ اور فلسفہ سے شغف رکھتے ہوں یہ ایک ایسی منزل کا پتہ دیتی تھیں جس کے بارے میں اردو میں بہت کم لکھنے والوں نے غور کرنے کی زحمت گوارا کی تھی ایک نئی لکھنے والی ادیبہ کے لئے بہت اچھی ابتدا تھی

میں نے رشیدہ رضویہ کے اس مجموعہ پر کس انداز سے تبصرہ کیا اس سے قطع نظر جو واقعات اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہوئے ان کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں چند ہی مہینوں کے بعد ساقی میں رشیدہ رضویہ کا ایک نیا افسانہ شائع ہوا عنوان مجھے یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ اس میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں جن کی اس اردو روزنامے کے تبصرہ نگار نے مذمت کی تھی پھر یکے بعد دیگرے ہر ماہ بلا ناغہ ان کے کئی افسانے ساقی کے علاوہ کئی دوسرے معیاری رسالوں میں شائع ہوئے اور ہر ایک میں بڑے واضح طور پر دانستہ وہی انداز اختیار کیا گیا ۔ جو تبصرہ نگار صاحب کو ناپسند تھا ۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک

ضدی بچہ وہی کام بار بار کرتا ہے جس کے لئے اسے منع کیا جاتا ہے اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ رشیدہ رضویہ نے واقعی ضد میں آکر اس زمانے میں ایک ہی انداز کی کہانیاں لکھی تھیں یا وہ ایک طویل کہانی کی مختلف کڑیاں چھوٹے چھوٹے حسین افسانوں کے روپ میں پیش کر رہی تھیں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس میں ضد کا شائبہ ضرور شامل ہوگا کیونکہ انہیں پچھلے تیرہ برس سے پڑھنے اور جاننے کے بعد اب یہ واضح ہوگیا ہے کہ لکھنے لکھانے کے موڈ کی طرح جان بوجھکر اپنے مخالفین کو غصہ دلانا بھی انہیں خوب آتا ہے۔

"کھنڈر کھنڈر بابل بابل" سے لے کر ان کی نہایت اہم تصنیف "گھر میرا راستے غم کے" تک کا سفر مصنفہ کی زندگی میں بڑی آزمائش لے کر آیا ہے اس دور میں اس حساس ادیبہ نے جمہوریت کی ناؤ ڈوبتی دیکھی دو فوجی حکومتوں کا عروج اور زوال دیکھا خانہ جنگی نے اسے خون کے آنسو رلاتے ملک کا ایک بازو ہمیشہ کے لئے کٹ کر جدا ہوگیا اور اس کے بعد عوامی جمہوریت کا سورج طلوع ہوا جو اپنے جلو میں ان گنت مسائل لایا رشیدہ رضویہ نے ان سب سے اثر قبول کیا جس کی جھلکیاں ان کے افسانوں اور ناولوں میں جا بجا ملتی ہیں ان کا خاصا وقت بیرونی ملکوں کی بطور خاص مشرق وسطی کی سیاحت میں گزرا وہ برسہا برس تک عراق میں رہی ہیں عربی جانتی ہیں عربوں کی قدیم تاریخ سے بھی بخوبی واقف ہیں اس لئے ان کی تحریروں کا کینوس اس قدر وسیع اور متنوع ہے ایچ جی ویلز اور آرنالڈ ٹائن بی کی طرح تاریخ ان کا پسندیدہ موضوع ہے فلسفہ کا بھی مطالعہ کیا ہے جسکی وجہ سے ان کے افسانوں اور ناولوں میں بعض پیشین گوئیاں

ایسی ہیں جو انکی اشاعت کے بہت بعد صحیح ثابت ہوئیں اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ ماضی حال اور مستقبل کے واقعات کو ان کی صحیح روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی کس حد تک صلاحیت ذہین انسانوں کو بخشتا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ رشیدہ رضویہ کی کہانیاں اور ان کے ناول دوسری خواتین کی لکھی ہوتی تحریروں سے اس حد تک مختلف ہیں کہ عام قاری کے پلے ان کی سوچ کی گہرائی ۔ استعارے ، تشبیہات اور وہ تمام سمبلز (SYMBOLS) جنکی جڑیں تاریخ کے دبیز پردوں میں پیوست ہیں ——— یہ سب باتیں نہیں پڑتیں رومان کی چاشنی ہوتی بھی ہے تو وہ اتنی نہیں کہ جوان لڑکوں اور لڑکیوں کی نیند حرام کردے محبت کی تپش مجھے ان کے افسانوں یا ناولوں میں کہیں نظر نہیں آتی غالباً اسکی وجہ یہ ہے ، کہ شروع ہی سے رشیدہ رضویہ نے انسان کی زندگی کے اس پہلو کو کبھی ، اہمیت نہیں دی ان کے یہاں تو اور بہت سے زیادہ اہم مسائل اتنے ہیں کہ محبت ہجر اور وصال نے سر اٹھانے کی کوشش بھی کی تو مصنفہ کے بے رحم قلم نے انہیں پس پشت ڈال دیا شاید اس لئے انہیں اور ان کی تصانیف کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوتی جو رضیہ بٹ یا دیگر ان اگنت خواتین لکھنے والوں کو ہوتی اس کے باوجود پڑھنے والوں کے سنجیدہ طبقے نے ہمیشہ ان تحریروں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اس کا ثبوت وہ شاندار تبصرے ہیں جو ان کے ناولوں کی اشاعت پر اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اپنے اس مضمون میں میرا ارادہ

رشیدہ رضویہ کے فن کا تنقیدی جائزہ لینا نہیں میں تو اس حق کی یا خاتون کی
شخصیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جس نے
ادیبوں کے حلقوں سے دور رہ کر بڑی خاموشی سے ادب کی خدمت
کی ہے اور اپنے لئے بڑی محنت اور جانفشانی سے ایک ایسا مقام پیدا
کیا ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر محسوس کر سکتی ہے اس کی پراسرار شخصیت
کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ادبی زندگی کا مختصر سا جائزہ لیا
جائے چونکہ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا افسانوں سے کی اس
لئے پہلے ان ہی کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ہر افسانے کو
علیحدہ علیحدہ پرکھنے کے بجائے مجموعی طور پر ان کا جائزہ لیا جائے تو
ان کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔ پہلے دور میں
زیادہ تر انہوں نے سماجی افسانے لکھے ہیں ۔ دوسرے میں خالص
سیاسی افسانے اور تیسرے دور میں جس میں سے وہ آج کل گزر رہی
ہیں خالص علامتی افسانے تخلیق ہوئے ہیں یہاں ان کا انداز وہی ہے
جو کسی حد تک ان کے ناول "لڑکی" "ایک دل کے ویرانے میں" اور بہت
حد تک گھر: میرا راستے غم کے" میں نظر آتا ہے طرزِ تحریر مختلف ہو تو
ہو لیکن غور و فکر کا انداز ایک جیسا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ
اب ان کا فن پختہ ہونے کے بعد عروج پر ہے ۔

اسی علامتی دور کے افسانے وہ بھی ہیں جو انہوں نے ایک
خاص شہر یا اس تجارتی ، مادی زمانے کے کسی بھی بڑے شہر کے بارے
میں لکھے ہیں ایک طرح یہ ان مٹتی ہوئی قدروں اور روایتوں کی عکاسی

کرتے ہیں جو ہماری زندگی سے بڑی تیزی سے غائب ہو رہی ہیں ان کی تکنیک اتنی نازک ہے الفاظ کا استعمال کچھ اس طرح کیا گیا ہے کہ ذرا سی ٹیس ان کی حقیقت بدل سکتی ہے ان کی اکثریت افکار میں شائع ہوتی ہے غالباً اس سلسلہ کا پہلا افسانہ جو ۱۹۷۰ء کے شروع میں شائع ہوا "خاموشی کی گونج ہے" جس میں "ہونٹوں" کو بڑی کامیابی سے علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کے بعد "شہر" کے سلسلہ میں غالباً پہلا افسانہ میری نظر سے گزرا جس کا عنوان تھا "شہر شروع ہوتا ہے" اسکی مرکزی کردار ایک لڑکی نینو تا ہے اور مصنفہ نے اس حقیقت کو بڑی اچھی طرح پیش کیا ہے کہ انسان کی اندرونی خباثت کا پرتو چہرہ ہے پھر دوسرا افسانہ پڑھا "شہر ختم ہوتا ہے" اس میں ایک دلچسپ کردار عرفان سے ہم متعارف ہوتے ہیں اور آخر میں مصنفہ ہم سے پوچھتی ہے ــــــــ اس شہر کا نام کیا ہو سکتا ہے جو اس سیدھی لکیر کے دونوں جانب آباد ہے گویا وہ یہاں کی الجھنوں میں کچھ اس قدر کھو گئی ہے کہ ہم سے پوچھتی ہے کہ تم ہی بتاؤ ہم اہل ہیں اور ہمارا رخ آخر کس طرف ہے ــــــ ؟

ان افسانوں کے بعد ایک اور افسانہ شائع ہوا "شہر جاگتا ہے" اور پھر اس کے بعد تو یوں محسوس ہوا کہ یکے بعد دیگرے کئی ایسے افسانے منظرِ عام پر آئے جن کے ذریعہ وہ پڑھنے والوں کو بتانا چاہتی ہو کہ انسان کا تمام وجود ایک وسیع گنجان شہر کے مانند ہے احساسات اور جذبات سمندر کی لہروں کی طرح ہیں انسانی چہرہ ایک ایک نقش ایک ایک لکیر ذہن کی مختلف پیغامات کی ترجمانی کرتا ہے انہیں پڑھ کر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کہ

ایک ہی بے جان شہر میں رہتے ہوئے مختلف لوگوں کے تاثرات بھی بے جان ہی ہوتے ہیں ایک انسانی چہرہ دوسرے انسان پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اس کی بھی بڑی عمدہ عکاسی کی گئی ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ رشیدہ رضویہ کے یہاں علامتیں ایسی ہیں کہ عام قاری کی سمجھ میں مشکل ہی سے آتی ہونگی یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں بڑا ادب بڑا فن ہر ایک کی سمجھ میں آجاتے تو پھر ان کا حسن اس قدر پر اسرار نہ رہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے یہاں ابہام ہے جی نہیں اس کے برعکس علامتوں کو نہ سمجھتے ہوئے بھی بغیر کسی الجھن کے ان کہانیوں کو پڑھا جا سکتا ہے یہاں جو بات صرف نقاد ہی سمجھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس طرح ایک مصوّر یا مجسمہ ساز اپنا ماڈل سامنے رکھ کر تصویر یا مجسمہ بناتا ہے اسی طرح رشیدہ نے بھی اپنے ذہن میں بعض علامتیں رکھ کر کہانیاں لکھی ہیں اور انہوں نے اپنے کرداروں کا کچھ اس طرح تجزیہ کیا ہے جس طرح مصوّر یا مجسمہ ساز اپنے ماڈل کا چہرہ تخلیق کرتے ہوئے اس میں بعض ایسی لکیریں شامل کرتا ہے جنہیں دیکھتے ہی اس انسان کا کردار آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اب ان کا فن اپنے عروج پر ہے ۔

یہی تمام خصوصیات ان کے تازہ ترین ناول "گھر میرا راستے غم کے" میں ہیں اس کا کینوس اتنا وسیع اور اسکی علامتیں اتنی مشکل ہیں کہ ان پر ایک مختصر سے مضمون میں اظہار خیال نہیں کیا جا سکتا اس کے لئے تو ایک تفصیلی مضمون ضروری ہے لیکن جو بات مختصراً لکھی جا سکتی ہے کہ ضدی سی لڑکی نے ایک بار پھر بعض ناک چڑھے نقادوں کی خدمت میں ایک

ایسی عمدہ کتاب پیش کی ہے جس میں وہ تمام باتیں ہیں جو انہیں صرف اس لئے نہیں بھاتیں کیونکہ وہ اب تک ماضی کی روایات سے اپنے آپ کو علیحدہ نہ کرسکے اس لئے وہ اس سے مطلق واقف نہیں کہ آج بیرونی دنیا میں ایک سے زیادہ غیر ملکی زبانوں میں اسی انداز میں ناول لکھے جا رہے ہیں اس کتاب میں بھی بعض پیشین گوئیاں کی گئی ہیں اب تک ایسی تحریروں میں رشیدہ رضویہ نے مستقبل کا آئینہ دکھا کر دنیا والوں کو خبردار کرنے کی کوشش کی ہے اور ہمیشہ ہی حالات کا دھارا اسی طرف ہی ہے جس طرف مصنفہ بہتے ہوتے دکھانا چاہتی ہے اگر اس ناول کا آئینہ بھی انسانوں کو اپنے پریشان کن مستقبل سے آگاہ کر کے انہیں خوابِ غفلت سے نہ جگا سکا تو انسانیت کا اللہ ہی حافظ ہے۔

ماضی میں رشیدہ رضویہ نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے مستقبل میں بھی ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

★★



میرزا محمود حیدری

جلیل حشمی

"آپ پکوڑے کیوں نہیں لیتے۔ ذرا چکھیے تو بڑے کرارے ہیں؟"

"لیتا ہوں۔"

"آپ تکلف سے کام لیتے ہیں۔ لیجیے میں اپنے ہاتھ سے پیش کرتا ہوں واللہ غضب کے پکوڑے ہیں۔"

"نہیں تکلف کی کوئی بات نہیں۔ البتہ سوچ رہا ہوں کہ آپ ناراض نہ ہو جائیں۔"

"میں کیوں ناراض ہونے لگا۔"

"بھائی بات دراصل یہ ہے کہ میں نے زندگی بھر ہندو کی ہاتھ کی بنی ہوئی چیز نہیں کھائی۔۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔"

"میں اس ظالم کے ہاتھ کا بنا ہوا قہوہ ہرگز نہ پیوں گا۔"

"کیوں۔"

"دیکھیے نا ایک میلی کچیلی جیکٹ پہنے ہوئے ہے۔ قمیص ندارد، ملاحظہ کیجیے اس کھجنگ کے سینے پر بالوں کے گھنے جنگل میں پسینہ ندیاں

کی طرح بہہ رہا ہے بغلیں دکھائی دے رہی ہیں۔ ہونہہ! مجھے اس کو دیکھ کر متلی ہونے لگی ہے اور آپ یہیں پر قہوہ پینے پر اصرار کر رہے ہیں۔ آگے چلیے کوئی اور دکان دیکھتے ہیں۔"

"اس میں ایک خوبی ہے، بہت بڑی خوبی۔"

"وہ کون سی؟"

"اس کے پاس اسمِ اعظم ہے۔"

"واقعی؟؟"

"نہیں سمجھے۔"

"قطعاً نہیں۔"

"یہ گندہ سہی لیکن پانچ وقت کلمہ پڑھتا ہے۔ پلید تو نہیں۔"

"وہ کیوں؟ اور اس وقت آپ؟ آپ دیکھتے نہیں کہ قیامت کی کی گرمی پڑ رہی ہے۔ اس وقت انسان تو انسان جانور بھی کونوں کھدروں میں بیٹھے ہیں اور آپ ـــــ"

"ہونہہ کیا تم یونیفارم میں نہیں رہے ہو اور اس عمر میں اس قدر سہل انگاری!"

"آخر اس وقت ایسا کونسا ضروری کام پڑ گیا ہے جو آپ آگ کا دریا عبور کرنے جا رہے ہیں۔"

"بھائی تم کیا جانو۔ مجاہد بھائی اس وقت فارغ ہوتا ہے اطمینان ہے گپ بھی رہے گی۔ اور جوتے کا ناپ بھی دے آئیں گے۔ یار جوتے

میں حُسن اور نفاست پیدا کرنا پشاور میں یہی ایک شخص جانتا ہے۔ اور شاعر بھی اچھا ہے۔"

"آپ کسی اور سے جوتے کیوں نہیں بنوا لیتے۔"

"کسی اور کے ہاتھ کا بنا ہوا جوتا کیوں پہنوں۔ مُربّی رکھوں اور مُربّہ نہ کھاؤں۔"

"اگر سن سٹروک ہو گیا تو کیا سر پر جوتا بیٹھ کر ملے م گا۔"

"لاحول ولاقوۃ، یار جانا نہیں چاہتے ہو تو باتیں نہ بناؤ۔ آخر شاعر ہو نا تو ہم اکیلے چلتے ہیں۔ اے تانگے والے۔"

"وہ سکیچ تم نے پڑھا ہے۔"

"کون سا؟"

"بھئی وہی جو کسی نے دریا خان کے فرضی سے نام سے لکھا ہے۔"

"ہاں وہی نا جس میں دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے چہرے بھی ہیں۔"

"ہاں ہاں تم نے پڑھا ہے۔ ٹھیک۔ اچھا یہ تو بتاؤ کس نے لکھا ہے واللہ مجھے اگر یہ شخص ہاتھ لگ جائے تو اپنے تاریخی ڈنڈے سے اسکی خبر لوں۔"

"کیا دریا خان نے آپ کے تعلق سے کوئی غلط اور بے بنیاد بات لکھ ڈالی ہے۔"

"اگر اس نے کوئی غلط اور بے بنیاد بات نہیں لکھی تو ایسی باتیں

کیوں لکھ دیں کہ پڑھ کر غصہ آجائے۔ نہیں جی میں اس دریاخان کو کب بخشنے والا ہوں۔"

"میرا خیال درست نکلا۔ آپ کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں اور یہ جو آپ کہہ رہے ہیں نری زیادتی کر رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ نے تمام عمر سچ کہا ہے لیکن آج دریاخان نے آپ کے تعلق سے سچ کہہ دیا ہے تو بھڑک اٹھے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے آپ راست گوئی پر ظلم کر رہے ہیں۔"

"واقعی تم نے ٹھیک کہا ہے۔ دریاخان نے میرے بارے میں جو کچھ لکھا ہے سچ لکھا ہے۔"

"دریاخان نے آپ کے سامنے صاف شفاف آئینہ رکھا۔ آپ نے اس میں اپنا چہرہ دیکھا تو پتھر اٹھا کر اس کو ڈھونڈنے کھڑے ہوئے افسوس ہے؟؟"

"ایک بات کہوں۔"

"شوق سے۔"

"میں تم سے معذرت چاہتا ہوں۔"

"کس بات کی۔"

"تم دریاخان ہو نا ظالم ——— آؤ پیار سے ذرا گلے لگ جاؤ۔ ہم دونوں لونیفارم میں رہے ہیں نا اور مجھے تم سے اس ناتے بھی محبت ہے۔"

"مشاعرے میں جاؤ گے؟"

"کیوں؟"

"تمہیں ریڈیو والوں نے کنٹریکٹ نہیں بھیجا؟"

"میں اپنے حق کو بھیک سمجھ کر مانگنے کا فن نہیں جانتا۔ اس سے خاموشی بھلی یہ سنگ بجائے خود سنگین۔"

"تو لو ہم بھی مشاعرے میں نہیں جاتے۔"

"آپ نے تو غضب کر دیا۔"

"کیوں؟"

"مشاعرے کا کنٹریکٹ جو پھاڑ کر پھینک دیا۔"

"یاری پھر کس کو کہتے ہیں۔ تم کو مخلص کی دوستی کا معیار معلوم نہیں پیارے۔"

"یار ہندو، کا خط آیا ہے لکھا ہے بہت بیمار ہے کراچی میں، بیچارے کو آب و ہوا راس نہیں آتی ہے۔ بس مرنے والا ہے۔"

"مر جائے آپ کو ہندوؤں سے کیا تعلق خاطر۔ آپ ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتے۔ اور جب بیمار ہوا تو دبلے ہونے لگے۔"

"تم نہیں سمجھے —— ٹھیک کہتے ہیں بڑے بوڑھے سخن ور ہونا اور بات ہوتی ہے اور سخن شناس ہونا الگ مضمون۔"

"آپ آج پہیلیاں گھڑنے کے موڈ میں ہیں۔"

"واقعی تم ہندو کو نہیں پہچانتے۔"

"پہچانتا ہوں لیکن اس ہندو سے قطعاً نابلد ہوں جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں۔ کیا کراچی میں اس کو کوئی حکیم یا وید نہیں ملتا جو اس نے آپ کو آپ کو لکھ بھیجا ہے۔"

"شاعر ہونا۔ بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ میں کہتا ہوں ہندو کراچی میں سخت بیمار ہے اور اس کے بیوی بچے یہاں پشاور میں پریشان ہیں اور تم ——— چھوڑو جی تم بھی نکمے آدمی ہو اگر یونیفارم میں نہ رہے ہوتے تو ———"

"اس دھونس بازی کو چھوڑ دیئے اور اپنے ہندو کا تعارف کرائیے ورنہ ———"

"ہاہا ہاہا، یار ہم شاعر لوگ بھی کیا مخلوق ہیں۔ وہ کسی نے کہا تھا کہ شاعر لوگ بلبل کے شکار کے لئے توپ استعمال کرتے ہیں۔"

"میں ڈر رہا ہوں کہ ادھر آپ کی باتیں طوالت کھینچیں گی اور ادھر کراچی میں ہندو کا کریا کرم بھی ہو جائے گا۔"

"ہائے شمیم بھیروی بڑا اچھا یار ہے۔ مرنجاں مرنج۔ سو گالی گن کر دو، مسکراتا رہے گا۔ لیکن ظالم ایک ایسی بات دبی زبان میں کہہ دیتا ہے کہ ساتوں کپڑوں میں آگ جاتی ہے۔"

"معلوم ہے میں اس کو ہندو کیوں کہتا ہوں۔ وہ بہت زیادہ کنجوس ہے اور وضع قطع کے اعتبار سے بھی وہ ہندو ہے۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگا کہ یار تم کو ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ یہ دور ہو جائے

تو اچھا ہو گا۔ یعنی تم جو اپنی شاعری کو طنزیہ اور مزاحیہ کا ٹائیٹل دیتے ہو۔
قطعاً مسخرہ پن ہے۔ ہاں تمہاری سنجیدہ شاعری اس سے بدرجہا
ارفع و اعلا ہے لیکن تم تو زرے گل محمد ہو۔ اسطرف کب توجہ دیتے ہو۔
میں بھلا کب اکی باتوں میں آتا ہوں"۔

"اچھا تو آپ بیچارے شمیم بھروی کو ہندو کہتے ہیں؟ لیکن معلوم ہے
ایک مسلمان بھائی کو ہندو کہنا کتنا بڑا گناہ ہے"۔

"میں تو پیار کو پیار سے ہندو کہتا ہوں۔ دل سے تو نہیں کہتا الحمدللہ
وہ ایک پکا مسلمان ہے، اللہ مجھے اور اس کو بھی مسلمانوں میں اٹھائے
آمین"۔

"یہ جو آپ نے اپنے دوستوں کے اپنے طور پر نام رکھ چھوڑے ہیں۔
اس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے"۔

"یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ میں دراصل اس بات کا قائل ہوں کہ نام
میں بھی انسان کا کردار جھلکے۔ لہٰذا میں نے دوستوں کے کردار کی مناسبت سے
ان کے نام رکھ چھوڑے ہیں"۔

"سنا ہے آپ فوج سے ڈسچارج لینے کی خاطر دوسری جنگ عظیم کے
دوران جان بوجھ کر پاگل بن گئے تھے"۔

"یہ بات آپ نے تذکرۂ ادبیات سرحد میں پڑھی ہو گی"۔

"ظاہر ہے"۔

دراصل میرے یار کو اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی۔ کاش اس کے

مصنف اس سلسلے میں مجھ سے بات چیت کر لیتے تو ایک غلط بات ضبط تحریر میں آجاتی۔ ذرا کاغذ قلم دینا۔"

"کیوں ؟"

"میں تم کو لکھ کر دیتا ہوں کہ میں پاگل بنا نہیں تھا بلکہ بدقسمتی سے پاگل ہو گیا تھا۔ بھلا کوئی شخص برابر تین برس تک مینٹل ہسپتال میں پاگل بن کر رہ سکتا ہے ؟ ناممکن بالکل ناممکن اور اسی دردناک واقعے نے میرا تمام کیریئر تباہ کر دیا۔"

"میری یہ تحریر سنبھال کر رکھنا۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔"

"آپ اتنا زیادہ قہوہ کیوں پیتے ہیں۔"

"پہلے تم مجھے اس سوال کا جواب دو کہ فرانس والے اتنی زیادہ شیری کیوں پیتے ہیں۔"

"یوں تو عرب بھی قہوہ پیتے ہیں۔"

"تو تم کو ہمارا قہوہ کیوں کھلتا ہے بھائی ؟"

"آپ شاعر ہیں، چاہیئے تو یہ کہ ادبی رسائل کا مطالعہ کریں لیکن اس کے برعکس آپ مختلف روزناموں کا پلندہ بغل میں دبائے رہتے ہیں۔ کیا صحافت آپ کے ادب کو فائدہ پہنچاتی ہے۔"

"بہت زیادہ اخبار بینی میرا محبوب مشغلہ ہے اور یہیں سے تو مجھے نت نئے موضوعات ملتے ہیں۔ اللہ غریق رحمت کرے مولانا ظفر علی خان کو مجھے ان کے اخبار زمیندار سے ان کی نظموں کا چسکا پڑا تھا۔ اور میری

شاعری کے ابتدائی دور میں ان کا اثر غالب رہا ہے۔ بہت برسوں کے بعد حضرت اکبر الہ آبادی کو پڑھا۔"

"یعنی اخبار اور قہوہ آپ کی کمزوریاں ہیں۔"

"تثلیث قائم نہیں ہوتی۔"

"مطلب۔"

"یہ کہ تثلیث کے بغیر بات نامکمل ہے۔"

"مثلاً؟"

"اخبار، قہوہ ــــــــــ اور حقہ۔"

"تمباکو نوشی کی کثرت آپ کو تکلیف دے گی۔ ویسے بھی آپ ہر وقت کھانستے رہتے ہیں۔"

"ڈاکٹر نے تمباکو نوشی ترک کر دینے کا مشورہ دیا ہے۔ دیکھئے کب ترک کرتا ہوں۔"

"سنا ہے آپ نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔"

"تم نے ٹھیک سنا ہے۔"

"کیوں۔"

"افسر ماتحتوں کو اپنا غلام تصور کرتا ہے۔"

"اس میں کیا مضائقہ ہے آخر اور لوگ بھی تو ملازمت کر رہے ہیں۔"

"اپنی اپنی طبیعت کی افتاد ہے۔ اگر تمہیں وہ ملازمت پسند

ہے تو جاؤ کرلو۔ ابھی میری کرسی خالی ہے "۔

" آپ ہی اپنی کرسی پر اچھے نظر آتے ہیں "۔

" میں اس کرسی پر لعنت بھیجتا ہوں جس کے پائے میں زنجیر بندھی ہو۔ اس سے تو بھوکوں مرجانا بدرجہا بہتر ہے "۔

" پھر کیا صورت ہوگی "۔

" اللہ مسبب الاسباب ہے "۔

" میں آپ کا خاکہ لکھنا چاہتا ہوں "۔

" دیکھو دریا خان باز آجاؤ ورنہ مغل کے ہاتھوں میں ڈنڈا ہے "۔

" آپ کی انگلیوں میں قلم زیب دیتا ہے "۔

" اور عزت کے تحفظ کے لئے ڈنڈا!! سمجھے "۔

" یوسف ظفر بچارا "۔

" اس سے بہت پہلے ایک اور صاحب بھی اس ڈنڈے سے متعارف ہونے پر سلیپر ہاتھوں میں پہن کر گھر کی طرف سرپٹ بھاگے تھے "۔

" یعنی یہ ڈنڈا آپ کی عمر کے ہر دور میں آپ کے ساتھ رہا۔

" فوج میں —— سرداری کا ڈنڈا تھا "۔

" آپ کے اشعار کی شان نزول کیا ہوتی ہے "۔

" میں سچ کا پرستار ہوں اور جو باتیں میری روزمرہ کی زندگی میں ہوتی ہیں۔ ان کو سیدھے سادے الفاظ میں لکھ ڈالتا ہوں۔ تم انہیں شعر سمجھ لو یا

بات کہو۔ مثلاً بہت عرصے کا ذکر ہے کسی کو تحفے کا طور پر پیش کرنے کے
لئے ایک سوٹ سلوایا تھا اس پر کہا ہے۔

سوٹ سلوانے کو یوں تو سِل گیا ❊ بِل جو دیکھا تو کلیجہ ہِل گیا

ایک بار دلّی ریڈیو پر آنجہانی پنڈت نہرو کی تقریر سننے کے بعد کہا تھا۔

اچھی تقریر کرتا ہے نہرو ❊ لیکن آواز تھرتھراتی ہے
ایسا محسوس ہوتا ہے محمودؔ ❊ جس طرح دال جوش کھاتی ہے

اور مہاجرین کو جو غلط الاٹ منٹیں ہوتیں تھیں۔ اس پر ایک
مصرع ہی سن لو کافی ہے۔

جو مکاں ملا تو دمشق میں جو دکاں ملی تو حجاز میں

"ذرا اپنے ڈنڈے کو دور رکھتے ہیں آپ سے ایک بات دریافت
کرتا ہوں۔"
"یہ لو اب پوچھو۔"
"آپ عموماً ملاقات کے دوران موڈ میں آکر کہتے ہیں۔ پیارے تازہ
کلام سنو اور جب ہم لوگ آپ کے برسوں پرانے، پہلے سُنے ہوئے قطعے
سنتے ہیں تو آپ کی راست گوئی پر شبہ ہونے لگتا ہے اس دوران اگر
غلطی سے کوئی تازہ شعر آپ نے سنا دیا تو الگ بات۔"
"میں نے بہت پہلے کہا تھا کہ تم سخن ور تو ہو سکتے ہو لیکن سخن فہم بننا
تمہارے بس کا روگ نہیں میرے قطعے کبھی پرانے نہیں ہو سکتے۔ یہ
سچے موضوعات لئے ہوتے ہیں۔ اور ان کے لئے مواد دھڑکتی ہوئی زندگی
سے اخذ کرتا ہوں۔ اب کہو زندگی کبھی پرانی ہو سکتی ہے تو زندگی اور سچائی ہمیشہ

جوان رہتی ہیں ۔ تروتازہ اور پاک و منزہ ؟؟"

" رات آپ مشاعرے میں شریک ہوئے تھے "۔

" ہاں میں نے اس مشاعری میں اپنے شعر پڑھے تھے"۔

" مشاعری یعنی چہ "۔

" اس لئے کہ اس میں کوئی قدآور شاعر تھا ہی نہیں "۔

" تو آپ وہاں گئے ہی کیوں تھے "۔

" یار یہ بات بھی تو بداخلاقی کے ذیل میں آتی ہے کہ کوئی تمہارے پاس چل کر آئے اور تم گھنٹہ گھر پر چڑھ بیٹھو اور نیچے اترنے کا نام نہ لو۔ یاد رکھو کہ شاعر پہلے انسان ہوتا ہے اور پھر شاعر اور اسے انسانوں کے ساتھ رہنا سہنا بھی تو ہوتا ہے ۔ کوئی بلائے تو چلے جایا کرو"

" قدآور شاعر سے آپ کی مراد غالباً مشہور شاعر ہے "۔

" ہرگز نہیں بلکہ قدآور شاعر وہ ہوتا ہے ۔ جو شعر برائے شعر کا قائل نہ ہو بلکہ اس کے شعر کے پیچھے ایک اور واضح اور افادی مقصد بھی موجود ہو، اور میرے نزدیک تو قومی تعمیر اور ملّی مفاد سے زیادہ ارفع و اعلا مقصد کوئی ہے ہی نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے مولانا ظفر علی خان اور حضرت اکبر الہ آبادی کو پسند کیا ہے اور انہیں لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش بھی کی ہے ۔

مرزا محمود سرحدی کی کون کون سی بات کو یاد کیا جائے ان کی

سیدھی سادی باتیں۔ اور برجستہ فقرے پوری محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ وہ حد درجہ نفاست پسند تھے۔ وہ سچے مغل تھے۔ یاروں کے یار اور بدخواہوں کی جان کے دشمن۔ دوست کی حمایت میں رات کو دن کر دکھاتے، ذرا سی ناپسندیدہ بات پر بھڑک اٹھتے اور مرنے مارنے پر تل جاتے۔ پھر وہ دو چار روز کے بعد جیسے وہ اس واقعے کو بھول جاتے لیکن دروغ گو احباب کو کبھی دل سے معاف نہ کرتے۔ دو تین دوست تو بدقسمتی سے ان کے ڈنڈے کی زد میں آ چکے تھے۔ ان کی تحریر اس قدر خوبصورت تھی کہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتیں۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ بعض احباب نے ان کی راست گوئی کے خوف سے ان کو ہمیشہ پیٹھ کی طرف سے چھرا گھونپنے کی کوشش کی اور اسی باعث ان سے نظریاتی اختلاف کو ذاتی مخاصمت کی بنیاد بنانا چاہا لیکن مرزا نے ان کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ ہاں وہ ایسے حضرات کو دو بدو کھری کھری سنا دیا کرتے تھے۔

وہ کوئی امیر یا رئیس نہ تھے۔ لیکن دل کے غنی تھے۔ دوست احباب کی خاطر تواضع کھلے دل اور کشادہ پیشانی سے کرتے اور جب تک ان کی جیب خالی نہ ہو جاتی اپنے مہمان کو اجازتِ رخصت نہ دیتے تحریر کے معاملے میں بے حد محتاط تھے۔ کوئی لفظ بلا ضرورت استعمال نہ کرتے۔ ان کی طرح الفاظ سے چند ہی لوگوں نے کام لیا ہے۔ مجھے تو پشاور میں ان کا اس سلسلے میں ثانی نظر نہیں آتا۔

مرزا عموماً کھادی کی اچکن اور استری شدہ قمیض شلوار پہنتے۔ بڑے سلیقے اور نفاست کے ساتھ ان کے جوتے ہمیشہ گرد سے پاک رہتے

ان کے ہاتھ میں اعلا قسم کی لکڑی کا ڈنڈا رہتا تھا جس کا دستہ چاندی کا تھا انتقال سے چند روز پہلے انہوں نے جشنِ غیبر کے مشاعرے میں شرکت کی اور یوں کی کہ شام سے صبح تک بیٹھے رہے اور شعراء حضرات کو داد دیتے رہے۔

سوچتا ہوں کہ ان کی کون کونسی بات آپ سے کہوں، اب ایسے باوضع غیور اور مہربان دوست کہاں!!

★ ★



دوموریہ پل کا انجینئر

مشتاق قمر

ادب کی گزشتہ دو ہزار سالہ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے دو باتیں صاف طور پر بیاں ہو جاتی ہیں اوّل یہ کہ ہر وہ تحریک جس میں قاری غائب تھا اپنی موت آپ مر گئی۔ دوم جس ادیب کو خود اس کے زمانے میں کوئی قاری میسر نہ آسکا وہ بعد کے زمانہ میں بھی اس اعزاز سے محروم رہا۔ ادب ادیب اور قاری کی تثلیث میں قاری کی حیثیت ایک ایسے قاعدے کی ہے جسے اس تثلیث سے تنہا کر کے کسی ادب پارہ کی جہت متعین نہیں کی جا سکتی ہر ادب پارہ کی ایک مخصوص جہت ہوتی ہے جس کا تعین ادیب کے لاشعور میں جو کرسی مارے بیٹھا قاری ہی کرتا ہے قاری سے مراد ایک ایسے حساس اور با شعور انسان سے ہے جو دوسروں کے دکھ درد اور مسرتوں کے خرمن سے اپنے دکھ اور مسرتیں تلاش کر لینے کا اہل ہو اور ادب سے مراد ایک ادیب یعنی باشعور اور حساس انسان کے خیالات کا ایسا اظہار ہے جو قاری کے ذہن میں اسکی اپنی بھولی بسری یادیں زندہ کرنے کے ساتھ ساتھ اسکے اندر کا ماحول اور وقت کا احساس بھی پیدا کر دے قاری نہ نہ صرف ادب کے معیار ہوتا ہے۔ بلکہ ادب کی تخلیق کے لئے خام مواد فراہم کرنے کا واحد ذریعہ بھی ہے دوسرے الفاظ میں ادب ایک

ایسا شعبدہ باز ہے جو پہلے قاری کی جیب سے اسکی تصویر نہایت ہوشیاری کے ساتھ نکال لیتا ہے اور پھر اسے وہی تصویر دکھاتے ہوئے اچھنبے میں ڈال کر کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

موجودہ بحث کے لئے نسلِ انسانی کو دو ٹکڑوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جو اپنے اپنے سروں پر واقعات و حادثات کا بوجھ اٹھائے نہایت خاموشی سے سرِ تسلیم خم کئے زندگی کی قوس و قزح کے اس پار چلے جاتے ہیں دوسرے وہ زندگی کے تجربات کا کسی نہ کسی شکل میں بر سرِ عام اظہار کرتے ہیں اس دوسرے گروہ میں ایک مقرر بھی ہو سکتا ہے۔ مجذوب بھی پیغمبر بھی اور ایک فن کار بھی ایک مقرر بھی ادیب نہیں بن سکتا مجذوب پیغمبر کی حیثیت سے اپنے آپ کو تسلیم کروانے میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے ان سب کے اپنے اپنے جداگانہ مقامات اور مقاصد حیات ہوتے ہیں اور ان کی پہچان ان کا اپنا اپنا مخصوص پیرایۂ اظہار ہوتا ہے ایک مجذوب اور ادیب کی شناخت سامنے یا قاری کی وساطت سے کی جا سکتی ہے مجذوب کی بڑ ایسا ہوائی فائر ہے جس سے دوسروں کو چونکایا تو جا سکتا ہے مگر اس میں مستقل نقوش چھوڑنے کی اہلیت نہیں اسکے برعکس ادیب اپنے خیالات و محسوسات کا اظہار مربوط و مبسوط شکل میں کرتا ہے اور خیالات و افکار کے آبگینوں کو بڑے قرینے سے الفاظ کی کشتی میں سجا کر اس طرح پیش ہوتا ہے کہ اس میں قاری کو اپنی ہی تصویر نظر آنے لگتی ہے چنانچہ ادیب کو اپنی انفرادیت اور شخصیت کی بقا کیلئے مقرر مجذوب اور پیغمبر سے الگ تھلگ اور جداگانہ لب و لہجہ اختیار کرنا پڑتا ہے وہ شدید لغزش کے بغیر اپنے لب و لہجہ سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ ایک طرف سٹاپ رپورٹر اور خطیب کا سیدھا سپاٹ اور دوسری طرف مجذوب

کا مبہم اور لایعنی عفریت اسے نگلنے کیلئے منہ کھولے بیٹھا ہے۔

منصور قیصر ایک ایسا ہی افسانہ نگار ہے اس نے پیرائیہ اظہار میں اس ادیبانہ لہجے کو برقرار رکھا "گراں دی بستی" کا کوئی پنجیر ہو جشن تمثیل میں کھیلا جانے والا ڈرامہ ہو طنز ہو یا افسانہ منصور قیصر ہر رنگ و روپ میں ایک ادیب کی بنیادی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہوتے دکھائی دیتا ہے وہ نہ تو اتنا مبہم ہے کہ اس پر مجذوب کا گماں ہونے لگے اور نہ ہی اتنا سیدھا سپاٹ کہ اسکی تحریر اخباری خبر میں ڈھل کر رہ جائے اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس کا فوری طور پر ابلاغ ہو جاتا ہے مگر تادیر ذہن کے افق پر جھلملاتی روشنیاں دعوتِ فکر دیتی رہتی ہیں اسکی ہر تحریر خصوصاً افسانہ نگاری کی دو پرتیں ہوتی ہیں ایک پرت تو وہ ہے جسے قاری ذہن فوری طور پر قبول کرتے ہوئے میٹھی گولی کیطرح نگل جاتا ہے لیکن جب اس پہلی پرت نے اچھی طرح "شکم سیری کے بعد قاری کا ذہن جگالی میں مشغول ہوتا ہے تو دوسری پرت اپنے وسیع تر مفاہیم کے ساتھ آشکارا ہونے لگتی ہے قیصر کے قاری کو بار بار اپنے آپ پر ایک ایسے مشینی ہل چلانے والے کسان کا دھوکہ ہونے لگتا ہے جو سارا کھیت طے کرنے کے بعد جب پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہے تو اسے کھیت کی زرخیز مٹی کے بیسیوں چہرے دکھائی دیتے ہیں یوں اچانک اپنے سامنے زمین کو گھونگھٹ اٹھاتے دیکھ کر اسکے اندر مسرت و بہجت کی پھلجڑیاں سی پھوٹنے لگتی ہیں اور وہ دنگ بھی رہ جاتا ہے منصور اپنے قاری کے ہاتھ سے بیسرانا ہل چھین کر اسے مشینی ہل کی گدی پر بیٹھا دیتا ہے۔ اسکی کشتِ افسانہ میں قاری کو خون پسینہ ایک نہیں کرنا پڑتا بلکہ ہم بڑے مزے سے ماہیا گاتے ہوئے کھیت کے دوسرے سرے پر

پہنچ جاتے ہیں لیکن ہمارا دوسرے سرے پر پہنچنا اکارت نہیں جاتا سوچوں کی فصل کئی گنا زیادہ پھل لاتی ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں اس پھل کی پوری شناخت بھی ہوئی ہے جس کے باعث قدرتی طور پر ہم بڑے اعتماد کے ساتھ اس ثمر شیریں سے استفادہ کرتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

منصور کا طرز تحریر بے حد شگفتہ اور ہلکا پھلکا ہے اسے ہنسی ہنسی میں سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع سے عہدہ برآ ہونے میں بلکہ خاص حاصل ہے اسکی اس شعبدہ گری نے اسے قاری سے قریب تر کر دیا ہے قاری کا پھر ذکر آگیا ہے دراصل جہاں ادب کا ذکر ہوگا وہاں بار بار قاری کا یاد آنا قدرتی امر ہے۔

اس کرۂ ارض پر انسان کو کبھی بھی کش مکش حیات اور اس کے پیدا کردہ گوں ناگوں مسائل سے فراغت نہیں ملی لیکن آج کے انسان (موجودہ بحث کیلئے) آج کے قاری کا المیہ یہ ہے کہ اسکے مسائل متضاد نوعیت کے ہیں اسکے ٹرائی ڈینٹ پر سینکڑوں میل کی مسافت چند گھنٹوں میں طے کرنے کی جہاں سہولتیں میسر ہیں۔ وہاں اسے ٹرائی ڈینٹ کی ہوائی قالین پر سوار ہونے کیلئے ایر پورٹ تک چھ میل کا فاصلہ بھی طے کرنا ہے اور یہ چھ میل کا فاصلہ پاٹنے میں اکثر و بیشتر اسے سینکڑوں میل کی مسافت سے زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے اس طرح وقت اور فاصلے کا تناسب بری طرح گڈمڈ ہو کر رہ گیا ہے اور ان متضاد مسائل کی مقناطیسی کیلوں نے اسے آج کے نقطے کے گرد جکڑ کر رکھ دیا ہے اسے اتنی فراغت نہیں کہ گذری ہوئی کل کی اشک شوئی کر سکے یا آنے والی کل کے سواگت کیلئے اپنے بغیچے سے خود اپنے ہاتھوں چند کلیاں

چن نے منصور نے آج کے انسان کے مسائل کو پوری طرح سمجھا اور اپنے افسانوں میں انہیں بڑے سلیقے سے برتا ہے وہ اپنے افسانوں کا تانا بانا ہمیشہ ارد گرد میں پھیلی ہوئی زندگی کے ریشے سے بنتا ہے اس کے افسانوی کرداروں میں آج کا قاری بڑی فراخدلی کے ساتھ اپنی اچھائیوں اور برائیوں کا اعتراف کرتا ہے وہ منصور کی وساطت سے اپنی قلمی تصاویر اور مجرد خیالات وافکار کی تجسیمی شکل میں کچھ ایسے پہلو بھی تلاش کر لیتا ہے جو اب تک لطافِ انسان کی نذر تھے مگر ان کا احساس دلانا بے حد ضروری تھا ۔

عام طور پر ہر زندگی کی نقاب کشائی میں وہ ایک طنز نگار کا حربہ استعمال کرتے ہوئے افسانے کی سکرین پر قاری کو صرف اسی زندگی کی تصویر دکھا کر سوئچ آف کر دیتا ہے روشنی سے پہلے کیا تھا اور روشنی کے بعد کیا ہونا چاہئے اس کا فیصلہ وہ قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے ۔

منصور کا افسانہ شگفتہ طرزِ بیان اور زندگی کی صحیح عکاسی کا ایسا "دوموریہ پل" ہے جس کی ایک طرف نئی زندگی کی سر بفلک عمارتیں چشمک زنی میں مشغول ہیں تو دوسری طرف گذری ہوئی کل کی جھونپڑیاں سرخ دوپٹے اوڑھے گردوپیش سے بے نیاز چرخہ کات رہی ہیں وہ پوری طرح اپنے لمحہ میں زندہ ہیں لیکن یہ لمحہ نہ تو وقت کے آسمان کا کوئی ٹوٹا ہوا تارا ہی ہے نہ الٹا چانے   یہ لمحہ وقت کے تسلسل کو قائم و دائم رکھنے والی ایک اہم کڑی ہے اسکی گزری ہوئی کل ابھی مری نہیں اور آنے والی کل کے آثار وقت سے پہلے ہی دکھائی دینے لگتے ہیں اسے ایک ایسے زمانے میں سائنس کی ڈوری سے حیات کا گولہ بننے پر مامور کیا گیا ہے جس کا ماضی حال سے کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں اس کا ماضی اپنی آن کے جھنڈے تلے سینہ تانے کھڑا ہے لیکن اسکے

ساتھ ساتھ وہ حال سے بھی کوئی سروکار رکھنا نہیں چاہتا اس نے اسکی باگ ڈور ڈھیلی چھوڑ دی ہے اور خود چلم میں تمباکو بھر کر اس وقت کے انتظار میں بہ صد اطمینان بیٹھ گیا ہے جب حال اپنا بیگ اٹھائے خود ہی دو موریے پل کی دوسری جانب پنپنے والی زندگی کی تلاش میں لوٹ آئے گا لیکن منصور جب پلٹ کر دو موریے پل کے اس پار دیکھتا ہے تو اس کا واسطہ ایک ایسی نسل سے پڑتا ہے جو وقت سے پہلے ہی جوان ہوگئی جس نے ابھی اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا لیا ہے جو ابھی سے حکم لگانے لگی ہے جسکی ڈوری کسی کے ہاتھ میں نہیں رہی اور منصور قیصر کا میرا آپ کا اور آج کے قاری کا المیہ بھی ہے زندگی نے مصنوعی لبادے اوڑھ لئے ہیں دس سالہ بچیاں اپنی فرضی جواں سال بہنوں کے نام پر پڑوس لڑکوں سے فلمی رسالے مانگنے لگی نئی نسل کلب کو میلے پر ترجیح دینے لگی ہیں اور رستم بالائے ستم میلوں کی بجائے اب عرص ہونے لگے ہیں خلوص اور صداقت زندگی کی کسی بہت نچلی منزل پر رہ گئے ہیں ایسے معاشرہ سے جنم لینے والا آج جب گذری ہوئی کل کی طرف لوٹتا ہے تو اسے وہاں بھی ٹوٹی ہوئی طنابوں اور بجھے بجھے چہروں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا زندگی کے ہنستے اور کھیلتے چہرے کو اس حد تک مسخ ہوتے دیکھ کر اسکے دل میں ہول سا اٹھنے لگتا ہے اور وہ گھبرا کر آنے والے کل کی طرف بھاگ اٹھتا ہے مگر آنے والی کل کی تیز روشنیوں میں اسکی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں وہ اندھا ہو جاتا ہے اسکے آگے اور پیچھے صبح اور شام کا جھٹپٹا سا چھا جاتا ہے اور وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہتا ہے کہ دھرتی پر پھیل جائے یا لحاف میں سمٹ جائے "دو موریہ پل" ہو "نئی نسل" ہو "پہلا پتھر" ہو یا "بے چراغ کی بستی" منصور قیصر اپنے ہر افسانے میں گرد و پیش سے پوری طرح باخبر نظر آتا ہے اور کم و بیش اس تیسرے افسانے میں گذری ہوئی آج اور آنے والی کل کے تینوں کردار اپنی تمام تر نفسیاتی الجھنوں اور انفرادی عادات و اطوار کے ساتھ ہمارے

سامنے لاتے ہیں وہ زندگی کی عکاسی اپنی ذات کی وساطت سے ضرور کرتا ہے کہ اسکے بغیر زندہ اور متحرک عکاسی ممکن ہی نہیں لیکن وہ قاری اور اپنی تخلیق کے درمیان ڈنڈا لے کر کھڑا نہیں ہو جاتا اسکے مشاہدہ میں زندگی کا جیسا بھی بُرا بھلا لمحہ آتا ہے وہ ایک سچے امانت دار کی طرح الفاظ کے سانچوں میں ڈھال کر اسے آپ کے حوالے کر دیتا ہے آیا ماضی کو حال سے کوئی سمجھوتہ کر لینا چاہیئے یا حال کو نوخیز کلی کا گھونٹ کر "دو موریہ پل" کی طرف والی زندگی کا پھر سے احیا کر لینا چاہیئے اس سے منصور کو کوئی سروکار نہیں یہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے وہ ایک اچھے ادیب کی طرح اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں لگاتا وہ تصویر کے تینوں رخ آپ کے سامنے پیش کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے اور سرخرو بھی!! اس طرح جہاں وہ ایک خطیب اور مجذوب سے الگ تھلگ اپنا ادیبانہ لب و لہجہ برقرار رکھنے میں پوری طرح کامیاب رہتا ہے وہاں آج کے دور کی نایاب جنس کاری سے بھی محروم نہیں کہ منصور کے افسانے میں قاری کے دل کی دھڑکنیں پوری شدت کے ساتھ محسوس کی جا سکتی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ صرف یہی ایک ایسا کارنامہ ہے جو اسے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

منصور نے اردو افسانے کو کیا دیا ہے اس کا غیر جانبدارانہ فیصلہ تو ہمارے دور کا ورق پلٹنے کے بعد ہی لگایا جاسکے گا لیکن اسکی ایک خصوصیت جو ہر قسم شک و شبے بالاتر ہے وہ اس کا لب و لہجہ ہے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب آنے والے وقت کا نقاد ہمارے دور کے دو موریہ پل پر سے گزرے گا تو اسے منصور کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوگی آنے والے نقاد کا محاسبہ بھی کرنا چاہا تو وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑی بے نیازی سے جواب دے گا "چھڈ یار خورے زندگی وچ کی کی ہوندا رہیا اے۔ توں کوئی لاہور دی گل سنا"۔

اور یہی منفرد لہجہ اور نیا آہنگ ہی بذاتِ خود بڑا قیمتی اضافہ ہے!



غلط نگاری

انور عنایت اللہ

اس شام کو رفیق غزنوی کچھ زیادہ سرور میں تھے۔ اس لئے ان کا طنز اور باتوں کی شوخی عروج پر تھی۔ کہنے لگے: "مانتا ہوں، صحیح اور غلط کا چکر بہت پرانا ہے۔ ایک بات، ایک فعل، ایک واقعہ، ایک معاشرہ میں صحیح سمجھا جاتا ہے تو دوسرے کے لئے یہ غلط ہو سکتا ہے لیکن یہاں، بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر معاشرے میں غلط ہوتی ہیں ان میں سے ایک سید ذوالفقار علی بخاری ہے!"

کسی زمانے میں، اپنے ایک مضمون میں رفیق غزنوی نے ریڈیو کے کنٹرولر کو غلط بخاری کا خطاب دیا تھا جو اس خوبی سے چپک گیا تھا کہ اسے یاد کر کے اغیار کے علاوہ بخاری صاحب کے دوست بھی محظوظ ہوتے تھے۔ پچھلے اتوار کو مرزا ظفر الحسن صاحب نے ٹیلیفون کیا تو خدا جانے کیوں مجھے یہ ساری باتیں یاد آ گئیں اور میں نے سوچا کیا رفیق غزنوی، بخاری صاحب کو "غلط بخاری" کا لقب دینے میں حق بجانب تھے؟ کیا واقعی بخاری صاحب کو ہم سے جدا ہوئے ایک سال ہو گیا تھا؟ ان کی یادگار قائم کرنے کے منصوبے کا خدا جانے

کیا حشر ہوا۔ نہ ان کی عسل صورت ہی کہیں نظر آئی اور ان کا ذکر ہی سننے میں آیا۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ طبیعتاً ہم لوگ باتوں کے دھنی ہیں۔ دنیا کے ہر موضوع پر، ہر وقت دھواں دھار تقریر کر سکتے ہیں۔ عمل کرنے کے مواقع یوں تو شاذونادر ہی آتے ہیں۔ لیکن بلائے ناگہانی کی طرح آ ہی جاتے ہیں تو ان سے نپٹنا بھی ہمیں خوب آتا ہے۔ شاید اسی لئے بخاری صاحب کی یادگار قائم کرنے کا مسئلہ بھی زبانی جمع خرچ سے آگے نہ بڑھ سکا۔

انہیں بھلا سے رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ وہ ایک بڑے آدمی بھی تو تھے۔ بڑوں کی یادگار کون قائم کرتا ہے؟ اب رہا غالب لائبریری میں آج کا یہ جلسہ۔ یہ تو مرزا ظفرالحسن کا حسنِ اہتمام ہے انہیں مجمع لگانے کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ وہ کسی نہ کسی بہانے، ادیبوں اور شاعروں، کو مرزا غالب کے زیرِ سایہ جمع کر ہی لیتے ہیں۔ سالگرہ نہ منائی جا سکے تو یومِ وفات ہی سہی۔

ویسے بھی بخاری صاحب کی یاد تازہ رکھنے کا حق مرزا صاحب کو بہت ہے۔ وہ ان چند لوگوں میں سے ہیں، جو جب تک ریڈیو پاکستان میں رہے، بخاری صاحب کے ساتھ آٹھ آٹھ نو نو گھنٹے کام کیا اور اپنے ساتھ ہم جیسے چھٹ بھیّوں کی ان گنت شامیں غارت کیں اور آٹھ آٹھ آنسو رلائے۔ ریڈیو کو خدا حافظ کہا بھی تو بخاری صاحب کو نہیں چھوڑا۔ موقع بے موقع ان سے ملتے رہے۔ اس وقت میں بے موقع ملاقات کا ذکر بطورِ خاص کر رہا ہوں کیونکہ ایک ایسی ہی ملاقات

کا خمیازہ مجھے مہینوں بھگتنا پڑا ہے۔ ہوا یہ کہ ایک بار بخاری صاحب روٹھ گئے اور فیصلہ سنا دیا کہ آئندہ وہ اسٹوڈیوز میں نہیں آئیں گے۔ اس زمانے میں اسٹیشن ڈائریکٹر فرید صاحب تھے۔ ان کے حکم پر مرزا صاحب، بخاری صاحب کو منانے گئے۔ جاتے ہوئے مجھے اور سید ناصر جہاں کو بھی ساتھ لے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ گھنیرے بادل چھائے ہوتے تھے۔ ساغر و مینا کا دور چل چکا تھا۔ اس لئے بغیر سوچے سمجھے ہمیں اندر بلوالیا۔ وہاں ہمارے روٹھے ڈائریکٹر جنرل اپنے ایک منظورِ نظر ماتحت سے دنیا کی بے ثباتی اور انسانوں کی احسان فراموشی کا دکھڑا رو رہے تھے۔ وہ ماتحت صاحب، میرے بھی افسر تھے اور مرزا صاحب کے بھی۔ انہیں ہمارا یوں بے موقع، اس بے تکلف ماحول میں پہنچ جانا، سخت ناگوار گزرا۔ اس واقعہ کے تھوڑے عرصے بعد مرزا صاحب تو بچ نکلے لیکن ان افسر صاحب کے عتاب کا مجھے مہینوں شکار ہونا پڑا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب موسیقی سے بخاری صاحب کا عشق عروج پر تھا۔ روزانہ آٹھ نو گھنٹے وہ اسٹوڈیوز میں نت نئے تجربے کرتے اور ہم سب کو موسیقی کے اسرار و رموز سے روشناس کرایا کرتے۔ میرے لئے وہ زمانہ بڑا ہی پرآشوب تھا۔ ناصر جہاں کی شادی نہیں ہوتی تھی۔ مرزا صاحب کی شادی قدیم سے قدیم تر ہو گئی تھی۔ ایک میں ہی تھا جو نو گرفتار بلا تھا۔ اس لئے ہر وقت الجھنوں کا شکار رہتا تھا۔ میرے ان مصائب سے بے نیاز، مرزا صاحب

اپنی ہی دھن میں مگن رہتے۔ بخاری صاحب کے ہر حکم پر لبیک کہتے لیکن کرتے وہی جو خود ان کا جی چاہتا۔ احتیاطاً ان کے تمام پسندیدہ فن کاروں کو ضرورت سے نوازتے رہتے تاکہ ان کی عاقبت سنوری رہے۔ اپنی مرضی کے بقیہ کام وہ بخاری صاحب کا نام لے کر کرتے کس میں اتنی مجال تھی کہ وہ تصدیق کی جرأت کرتا۔

مرزا صاحب بڑے ذہین آدمی ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ بخاری صاحب پر ہر وقت کچھ اس قدر انتشاری عالم طاری رہتا اور صبح سے شام تک وہ اپنے اتنے بہت سے ماتحتوں کو، چلتے پھرتے، ان گنت احکام صادر کیا کرتے کہ انہیں مشکل سے یاد رہتا کہ انہوں نے کس کو کون سا حکم دیا ہے۔ مرزا صاحب کا یہی حال تھا۔ بخاری صاحب کا یہ معمول تھا کہ روزانہ براڈ کاسٹنگ ہاؤس آتے اور اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھے اسٹوڈیوز میں چلے جاتے، جہاں بات بات پر ہاتھ باندھے، سر ہلا ہلا کر "جی سبحان اللہ"۔ "جی ماشاءاللہ" کہنے والے سازندے اور موسیقار ان کے منتظر ہوتے۔ ان کا زیادہ وقت ان ہی لوگوں کے ساتھ گزرتا۔ بخاری صاحب کے درباری تو یہ لوگ تھے ہی، مرزا صاحب کے، میں اور ناصر جہاں۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر اسٹوڈیوز میں جاتے اور پروگراموں کی ریکارڈنگ کا اہتمام کرتے۔ ان حالات میں اسٹیشن کے بڑے افسروں اور بخاری صاحب کے درمیان رابطہ، زیادہ تر مرزا ظفرالحسن اور ان کے دو چھٹ بھیّوں ہی کے ذریعہ قائم

رہتا، اس لئے بخاری صاحب کو جو بھی شکایت ہوتی مرزا صاحب ہی سے اس کا ذکر کرتے، غالباً اس امید پر کہ دوسرے دن یہ شکایت اسٹیشن ڈائریکٹر تک پہنچا دی جائے گی۔ خدا معلوم مرزا صاحب یہ کام انجام دیتے بھی یا نہیں۔ لیکن وہ یہ ضرور کرتے کہ دوسرے دن دفتر پہنچتے ہی بخاری صاحب کے حکم پر چھوٹا سا پرچا حوالہ دیتے ہوئے فوراً ایک کمیٹی تشکیل دیتے اور اس کے اراکین سے کہا جاتا کہ وہ فلاں موضوع پر کام شروع کر دیں، اس کے تمام پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیں اور اپنی سفارشات دس دن کے اندر پیش کر دیں مرزا صاحب نے اس قسم کی خدا جانے کتنی مخصوص کمیٹیاں بنا رکھی تھیں اور مجھے یوں لگتا جیسے یہ سب پنج سالہ منصوبے کے تحت کام کر رہی ہوں۔ کیونکہ ان کی سفارشات کبھی منظرِ عام پر نہیں آئیں۔ اس زمانے میں مرزا صاحب کو یقین تھا کہ صرف اسی طرح بخاری صاحب کو چکّر میں ڈالا جا سکتا ہے۔

ایک دن حسبِ معمول بخاری صاحب آئے۔ اور اسٹوڈیوز میں جانے کے بجائے مرزا ظفر الحسن کے کمرہ میں بیٹھ گئے۔ ہمیں بھی بلوایا گیا، جوں ہی ہم کمرہ میں داخل ہوئے انہوں نے بڑے ڈراماتی انداز میں اپنی عینک اتاری، اپنی بڑی بڑی گھنی بھویں سیکڑ کر غور سے ہمیں دیکھا اور اپنی کھرج میں کہا۔

"آج آپ کے محبوب اناؤنسر آغا جان صاحب کا ایک اعلان سنا۔ حسبِ معمول انہوں نے ایک اور لفظ کا نیا تلفظ ڈھونڈ

نکلا ہے۔ انہوں نے اسے یوں ادا کیا ہے کہ اس سے ایک بڑی خطرناک گالی کا گمان ہوا۔ ان سے اس موضوع پر گفتگو بیکار ہے کیونکہ وہ کبھی قائل نہیں ہوں گے۔ اس لیے میں آپ حضرات سے گفتگو کر رہا ہوں۔ کیا اب آپ سامعین کو گالیوں کا درس دینا چاہتے ہیں؟ خدا کے لیے کچھ کر دیار۔ آغا جان کا یہ بچہ ہم سب کو ذلیل کروا کے دم لے گا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی اور معقول کام کرے اور میرا اور سننے والوں کا پیچھا چھوڑ دے؟"

آغا جان، مرزا یگانہ چنگیزی کے صاحبزادے ہیں اپنے عظیم والد کا جلال اور ان کی ضدی طبیعت انہیں ورثہ میں ملی ہے۔ ان سے بخاری صاحب کا غصہ ہمیشہ وقتی ہوتا کیونکہ یگانہ صاحب کی وجہ سے وہ آغا کا بہت خیال رکھتے۔ اس دن، اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہتے وہ مرزا ظفر الحسن کی طرف مڑے اور بولے۔

"ظفر۔ میرے خیال میں تم فوراً ایک اور نئی کمیٹی بنا ڈالو۔ گالیوں سے متعلق تمام مسائل اور ان کی مائکروفون پر روک تھام کے موضوع پر دس دن کے اندر رپورٹ طلب کر لو۔ مناسب سمجھو تو آغا جان کو بھی اس کمیٹی کا رکن بنا دو۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ تمہارے اسٹیشن پر اب کوئی ایسا باقی نہیں بچا جو کسی نہ کسی کمیٹی کا رکن نہ ہو۔"

اس دن مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص کوئی حکم دے کر کبھی نہیں بھولتا۔ اگر کسی وجہ سے وہ دوبارہ اس کا ذکر نہیں کرتا تو اس میں

اس کی غائب دماغی سے زیادہ یقیناً کوئی مصلحت ہوتی ہوگی۔

برصغیر میں ریڈیو کے ابتدائی دور ہی سے ان کا تعلق اس میڈیم سے ہو گیا تھا۔ اس لئے انہیں اس حد تک اس میں دخل تھا کہ لوگوں نے انہیں مائکروفون کا بادشاہ قرار دیا تھا۔ ان کے کان اتنے حساس تھے کہ وہ پروگرام سنتے ہوئے گھر سے ہمیں ٹیلیفون پر اکثر یہ بتایا کرتے تھے کہ ہم نے اس پروگرام کے لئے فلاں اسٹوڈیو کا انتخاب صحیح کیا تھا یا غلط۔ وہ یہ بھی بتا سکتے تھے کہ سازندہ کون ہے اور کہاں بیٹھا ہے، جب تک وہ ڈائریکٹر جنرل رہے، کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ پروگرام کے سلسلے میں انہیں چکر دے سکتا کیونکہ کسی بھی نوعیت کے پروگرام کی۔ چاہے وہ ڈرامہ ہو، موسیقی کا ہو یا تقریر ہو۔ اس کی تخلیق کے تمام مرحلوں سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں، ہر مرحلہ سے وہ خود گزرے تھے۔ اس لئے نشریات کی تمام اُلجھنیں، تمام پیچیدگیاں، روزِ روشن کی طرح ان پر واضح تھیں۔

پچھلے سال ان کے بارے میں بہت سے مضامین لکھے گئے ان میں ان کے محاسن تو بہت بیان کئے گئے لیکن کسی نے ان کی ہٹ دھرمی، ان کی ضدی طبیعت، ایک ہی رخ دیکھنے والے جذباتی ذہن، ان کی شدید پسند اور ناپسندیدگی اور ان کے غیظ و غضب کا ذکر نہیں کیا۔ اگر کیا بھی تو دبے لفظوں میں، کراچی میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو ان کے غضب کا شکار ہوئے۔

ان کے ایک ہی رُخ کو دیکھنے والے ذہن کی وجہ سے کئی باصلاحیت لوگوں کو نقصان پہنچا۔ انہیں استاد بندو خان سے اس حد تک لگاؤ تھا کہ وہ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی دوسرا موسیقار اپنے آپ کو استاد بندو خان مرحوم کا ہم پلہ سمجھے۔ ان کے اسی سخت رویے کی وجہ سے پاکستان نے استاد بڑے غلام علی خان جیسے عظیم موسیقار کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ بخاری صاحب کے حکم پر ہیں نے ہی انہیں روکنے کی آخری کوشش کی تھی لیکن بخاری صاحب ہی نے اتنی بہت سی شرائط لگا رکھی تھیں کہ کوئی بھی غیرت مند انہیں قبول نہ کرتا۔ ان کی پسند اور ناپسندیدگی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے منظورِ نظر، بعض معمولی گانے والوں کو پاکستان کے سب سے سُریلے موسیقار سمجھتے تھے اور ان کی رائے میں رؤف صاحب جیسے عظیم موسیقار بے سُرے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات تھی جب دنیا مانتی تھی کہ غزل کی گائیکی میں حیدرآباد دکن کے رؤف صاحب سے بہتر موسیقار، ان کی زندگی میں پیدا نہیں ہوا۔

بخاری صاحب کی ذات سے بعض لوگوں کو نقصان پہنچا۔ تو ان سے کہیں زیادہ لوگوں، ان گنت شاعروں، موسیقاروں ادیبوں، یتیموں، اور بیسروں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ جب تک برسرِ اقتدار رہے، ریڈیو کے بے تاج بادشاہ بنے رہے۔ کسی موسیقار یا سازندے سے خوش ہوئے تو سال میں کئی بار اس کی تنخواہ میں اضافے کا حکم دے دیا کبھی، بہت زیادہ خوش ہوئے تو

پلک جھپکتے اس کی تنخواہ میں ڈیڑھ سو روپے تک اضافہ کر دیا کبھی سے خفا ہوئے تو اس کی زندگی عذاب کر دی۔ آخر وہ ہماری طرح گوشت پوست کے انسان ہی تو تھے۔ فرشتہ نہیں تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ ان میں اچھائیاں زیادہ تھیں یا برائیاں۔ اس کا فیصلہ آپ کر سکتے ہیں۔ دراصل ان کی زندگی، ان کی شخصیت اتنی متنازع فیہ رہی کہ وہ اچھے تھے یا برے عظیم تھے یا فراڈ اس کا فیصلہ تو مستقبل ہی کرے گا جب بھی میں ان کے بارے میں کچھ سوچتا ہوں، مجھے ان کی شخصیت دھنک کے مانند نظر آتی ہے جس میں سات رنگ ہوتے ہیں۔ ہر رنگ علیحدہ ہونے کے ساتھ بے حد خوشنما ہوتا ہے۔ بخاری صاحب اچھے غزل گو شاعر تھے، بہترین خوش تقریر اور بذلہ سنج۔ درباروں سے دور رہنے کے باوجود، ہر وقت چاہتے کہ ان کے گرد، دربار سجا رہے اور وہ مسند پہ بیٹھے دنیا کے ہر موضوع پر اپنے درباریوں کو درس دے سکیں۔ ہندوستان میں رہے تو ان کا یہی حال رہا۔ انگلستان گئے تو وہاں کی ثقافتی دنیا کے بڑے بڑے جیّد دانشوروں کی محفل کی رونق بنے رہے۔ مشہور نقاد اور شاعر، ٹی۔ ایس ایلیٹ نے اپنی ایک تصنیف میں جس طرح ان کا ذکر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وہاں کے ادبی حلقوں میں کس حد تک مقبول ہوں گے۔

اتنی ترقی کرنے کے باوجود انہیں حفظِ مراتب کا بہت خیال رہتا۔ آرزو لکھنوی ہوں۔ یا مولانا حسرت موہانی، پطرس ہوں یا پروفیسر

مرزا محمد سعید۔ ان بزرگوں سے ایسے ادب سے ملتے جیسے پرائمری کا بچہ اپنے استاد سے۔ مولانا حسرت موہانی کی جوتیاں اس طرح لپک کر سیدھی کرتے جیسے اگر یہ سعادت کھودی تو حشر کے دن انجام بُرا ہوگا۔ استاد بندو خان کے پروگرام کی نگرانی اکثر خود کرتے، پروگرام سے پہلے ان کی چلم اپنے ہاتھ سے بھر کر پیش کرتے تاکہ انہیں ذہنی سکون ملے اور قیام پاکستان کے فوراً بعد ان پر جو زیادتیاں ہوئیں، ان کی تلافی ہو سکے۔

بخاری صاحب سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی۔ جب وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ اس کے بعد دوسری ملاقات ۱۹۴۹ء میں ہوئی جب پروڈیوسروں کی بھرتی کے سلسلے میں وہ ڈھاکہ آئے تھے۔ آخری ملاقات انتقال سے بارہ تیرہ دن پہلے ہوئی ایک مذاکرے کی انہیں صدارت کرنی تھی اور مجھے مضمون پڑھنا تھا۔ اس دن پہلی بار وہ مجھے بہت بوڑھے نظر آئے۔ آنکھوں پر بہت موٹے شیشوں کی عینک تو تھی ہی۔ اب چہرہ کی جھریاں بھی نمایاں ہو گئی تھیں۔ اور چلتے ہوئے انہیں سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ ریڈیو سے علیحدہ ہونے کے بعد جن تکلیف دہ حادثات سے انہیں دوچار ہونا پڑا تھا، جس طرح ان لوگوں کی اکثریت نے انہیں بھلا دیا تھا، جن پر ان کے بے شمار احسانات تھے۔ ان تمام تلخ باتوں کا انہوں نے بہت اثر لیا تھا۔ زبان سے وہ کچھ نہیں کہتے تھے لیکن

ان کی ہر ادا سے احساس ہوتا تھا کہ وہ حالات سے کس قدر دل برداشتہ ہیں۔

پچھلے چند سال کے دو واقعات ایسے ہیں جن سے میں بہت متاثر ہوا۔ پہلا واقعہ ۱۹۷۱ء کا ہے۔ میں اس زمانے میں ٹیلیویژن میں تھا۔ ایک دن بیٹھا کام کر رہا تھا کہ یکایک دیکھا وہ سامنے کھڑے ہیں۔ میں نے فوراً اٹھ کر سلام کیا اور کرسی پیش کی تو بیٹھ گئے۔ مجھے غور سے دیکھا اور کہا۔

" آج ہی سنا کہ مشرقی پاکستان میں تمہارے عزیزوں کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا تھا۔" میں نے اپنی بپتا سنائی تو غور سے سنتے رہے۔ پھر غمگین لہجے میں کہا۔

" خدا تمہیں صبر دے اور یہ دکھ برداشت کرنے کی ہمت دے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا جیسے اپنی خاموش زبان میں مجھے یقین دلانا چاہتے ہوں کہ میرے دکھ میں وہ برابر کے شریک ہیں۔ مجھے ریڈیو سے علیحدہ ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ انہیں بھی ریڈیو چھوڑے مدت گزر گئی تھی۔ ہمارا بہت ملنا جلنا نہیں تھا۔ ویسے بھی ان کے اور میرے درمیان نوکر شاہی کی بڑی خلیج رہی تھی۔ اس کے باوجود جب انہیں میرے غم کی اطلاع ملی تو وہ خدا جانے کہاں سے چل کر میرے پاس مجھ سے ملنے آئے تھے۔ تاکہ دلاسا دے سکیں۔ وہ نہ آتے تو میں ان کی کمی کبھی محسوس نہ کرتا لیکن آئے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی اور بڑا سکون ملا

اور مجھے غلط بخاری کے اندر ایک نہایت ہی صحیح انسان نظر آیا جو اپنے ایک سابق ماتحت کے ذہنی کرب کو کم کرنے کے لئے دور سے چل کر آیا تھا۔

اس کے بعد میں نے انہیں ایک ایسی حالت میں دیکھا کہ مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ ایک رات کو میں دفتر سے نکلا اور ٹیکسی کی تلاش میں سڑک پر پہنچا تو ایک خالی ٹیکسی کے پیچھے بخاری صاحب کو بھاگتے دیکھا۔ ان کی گاڑی گیراج میں تھی۔ انہیں ضروری کام تھا۔ اس لئے ٹیکسی ڈرائیوروں کے رحم و کرم پر وہ گھر سے نکلے تھے۔ معاً مجھے وہ زمانہ یاد آگیا جب ان کی خدمت کے لئے ہر وقت ریڈیو کی درجن گاڑیاں موجود رہتیں۔ اگر کبھی ان کی گاڑی خراب ہوتی تو گیراج کا مالک حمید فوراً ایک سے ایک بڑی اور شاندار گاڑی ان کی خدمت میں پیش کرتا، وہ نہ ہوتا تو ان کے ان گنت دوست ہر وقت ان کی خدمت میں اپنی گاڑیاں پیش کرنے کو تیار نظر آتے۔ آج وہی سید ذوالفقار علی بخاری ایک خالی ٹیکسی کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ اور ٹیکسی والے نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ کلفٹن نہیں جائے گا!

آخر میں ایک واقعہ اور سنئے۔ مجھے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیئے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ میں کسی کام سے سندھ کلب گیا تو وہاں لاؤنج میں بخاری صاحب مل گئے۔ حسب معمول بڑی شفقت سے ملے اور پوچھا کہ کیا واقعی میں نے سرکاری ملازمت

سے استعفیٰ دے دیا تھا؟ "خدا کے بندے، آخر اتنا عاقبت اندیش قدم کیوں اٹھایا؟ ریڈیو میں واپسی پر تمہیں کمرشیل سروس کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا تھا؟ پھر ایسی کون سی تباہی آئی کہ تم نے یہ خطرناک فیصلہ کیا؟"

میں نے دیکھا کہ وہ خاصے مضطرب نظر آ رہے تھے۔ جیسے میرے فیصلے سے انہیں دکھ ہوا تھا۔ "میرے حالات تکلیف دہ بنا دیئے گئے تھے بخاری صاحب۔" میں نے جواب دیا۔ "میرا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ میں نے باہر سے آئے ہوئے نئے افسروں کے حکم پر چلتے ہوئے جنہیں نہ ریڈیو سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس کے تقدس کا پاس تھا۔ ان کے حکم پر میں نے اپنے بعض بے گناہ ماتحتوں کی گردن پر چھری چلانے سے انکار کر دیا تھا اس کی سزا میں مجھ پر یہ عتاب نازل ہوا تھا۔ اگر آپ جیسے افسر موجود ہوتے تو مجھ پر یہ قہر نازل نہ ہوتا۔ لیکن بخاری صاحب اس زمانے میں تو ریڈیو سے انسان بڑی تیزی سے غائب ہو گئے تھے۔ اور ان کی جگہ صرف افسر آ گئے تھے۔ خیر۔ میں نے اچھے وقت پر ریڈیو چھوڑا۔ اب میں بہت خوش ہوں وقت نے صحیح ثابت کر دیا کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔"

جب تک میں بولتا رہا وہ خاموشی سے سنتے رہے لیکن چہرہ سے لگتا تھا جیسے انہیں دکھ ہوا میرے ساتھ اتنی زیادتیاں ہوئیں یکایک انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولے۔

"بیٹے خدا کرے مستقبل میں بھی یہی ثابت کرے۔ ورنہ یہ

دنیا موقع پاتے ہی ڈنک مارتی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔

آج جب وہ ہم میں نہیں ہیں اور ان کی صرف یادیں باقی رہ گئی ہیں، میں سوچ رہا ہوں۔ صحیح اور غلط، اچھے اور برے کا یہ چکر کیا ہے؟ ہم جیسے گنہ گار انسانوں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم کسی کو برا یا غلط کہیں؟ اگر بخاری واقعی غلط تھے تو انہیں کیا پڑی تھی کہ مجھ سے یوں ہمدردی جتاتے۔ شاہد احمد دہلوی، استاد بندو خان، ڈراما آرٹسٹ عبدالماجد، خواجہ معین الدین۔ ان سب کی موت پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے۔ اپنے عروج کے زمانے میں تمام بوڑھے، یتیم اور بے کس فن کاروں کی ہمیشہ فراخدلی سے سرپرستی کرتے اور اپنے تمام تر غرور اور جلال کے باوجود دانشوروں کی، بزرگوں کی عزت کرتے؟

مجھے ان گنت اچھے اور برے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے جس میں اتنی بہت سی اچھائیاں ہوں، اور اس کے بعد بھی وہ غلط آدمی ہی کہلائے۔

سوچتا ہوں آج کی دنیا میں ایسے کئی اور غلط بخاری پیدا ہو جائیں تو کچھ ہو یا نہ ہو۔ کم از کم دانشوروں، مفکروں اور فن کاروں کے تمام مسائل حل ہو جائیں۔ کیا اس قسم کے خواب دیکھنے والے انسان کو بھی آپ غلط آدمی ہی کہیں گے؟؟؟

★ ★



ڈرامے کا آدمی

اشفاق احمد

اندر مردانہ اور نسوانی آواز کے قہقہے ہوں اور باہر دستک دینے والے کو کہا جائے "وہ گھر پر نہیں ہیں۔"

جس خاتون پر بھری محفل میں راز کی بات نظم کے پیرائے میں پڑھی جائے اور اس کے استفسار پر کہا جائے۔ "وہ آپ نہیں ہیں محترمہ، پر آپ برا کیوں مان گئیں۔"

اور پھر ایسے ہی کسی اور لمحے میں پشیمان اور EMBARRESED بیگم صاحب جب نام پوچھیں اور شاعر کہے "۔ نام کیا پوچھتی ہیں نام میں کیا رکھا ہے۔ میں تو گمنام سا ایک شخص ہوں بیگم صاحب۔"

یہ سارے نام ڈرامائی ہیں۔ ان سب میں خطرے کی گھنٹی بجتی ہے، چھپے ہوئے المیے، سائرن بجاتے ہیں اور اگر بیک پروجیکشن سے کام لیا جا سکے تو لمبی چوڑی CONFLICT کہانی کے روپ میں نظم کے پیچھے پھیلی نظر آتی ہے۔

دراصل قتیل شفائی ڈرامے کا آدمی ہے اگر تھیٹر کا زمانہ

ہوتا تو وہ آغا حشر کے جیسے ڈرامے لکھتا جن میں اس کی شاعری کو بھی جگہ ملتی، نظم آمیز نثر کو بھی اور پلاٹ کے جوہر بھی کھلتے۔ ہر وقت ESCALATOR کی طرح ہے۔ کچھ لوگ کسی اور عہد سے تعلق رکھتے ہیں، کسی اور قسم کی روایات اور ماحولیات میں زندہ رہتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے ہلتے بھی نہیں پھر بھی وقت کا ESCALATOR انہیں اوپر کی طرف اٹھائے لئے جاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ قتیل شفائی کی سوچ میں موسیقی ہے، شاعری ہے، پرانی روایت ہے لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ وہ ڈرامے کا آدمی ہے اور تھیٹر سے بچھڑ کر وقت کے ESCALATOR پر سوار فلمی دنیا میں چلا گیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ جو شہرت اسے فلمی گیتوں سے نصیب ہوئی ہے اس کے بنیادی ضمیر کی وجہ سے جس کا اصل تعلق تمثیل اور تماثیل سے ہے!

قتیل کی تقریباً ہر نظم ایک مکالمہ ہے یا خود کلامی ہے یا حدیثِ نفس ہے۔ چاہے وہ کسی دوسرے کو قائل کرنے کے لئے بات کرے یا اپنے اندر سوئے ہوئے درندوں کو گہری نیند سلانے کے لئے انہیں کہانی سنائے اس کی پوری قصہ ہے، خالدہ شباب کی رخصتی پر دل ہی دل میں نصیحتیں کرتی ہوں یا دروازے کے پیچھے سے فاقوں مارے کتے کو خاموش رہو سنتا ہو، اس کے شاعری کے اندر باتوں کے پس منظر میں

اور باتیں بھی ہیں۔ ڈراماتی انداز ہیں، ڈراماتی لمحوں میں کبھی کبھی یہ گفتگو قتیل کی نظم کا اہم حصہ نہیں ہوتی۔ آپ کے ساتھ بھی یہ واقعہ گذرا ہوگا۔ کبھی اگر آپ ٹیلی وژن کی آواز بند کر کے صرف تصویر دیکھنے لگیں تو اس بے زبانی میں اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے اور مفہوم مختلف رنگ بدلنے لگتا ہے۔ اس طرح کبھی کبھی قتیل کی نظم میں مکالمہ بند ہو جاتا ہے۔ لیکن گفتگو کا نقش اور گہرا ہونے لگتا ہے۔

ڈراما کبھی سماج کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ شاعری تو پتھروں ہواؤں، بادلوں، دریاؤں سے پیدا ہو سکتی ہے، لیکن ڈرامے کیلئے معاشرہ درکار ہوتا ہے۔ سر پھوڑنے والی، لہریں لہروں کے آگے لوہے اور کنکریٹ کے بند لہروں کو پھینٹنے والی مشینیں اور لہروں کو دم بخت کر کے بجلی نکالنے والے ٹربائنز آزاد انسان جو مثل لہروں کے ہے معاشرے کے کنکریٹ سے ٹکرا کر عموماً کار آمد تو بن جاتا ہے اس میں سے بجلی تو نکل آتی ہے، قمقمے تو جل اٹھتے ہیں لیکن ان کے اندر کا غنا ختم ہو جاتا ہے، اس کا ردم ٹوٹ جاتا ہے جس وقت یہ ردم ٹوٹتا ہے اسی وقت ڈراما پیدا ہوتا ہے۔ نثری ڈرامے میں اور قتیل شفائی کی ڈراماتی نظموں میں صرف فرق یہ ہے کہ قتیل کے ڈرامے میں غنا باقی رہتا ہے، لہروں کا ردم نہیں ٹوٹتا گرداب بھنور رہتے ہیں بپھرے ہوئے لہریں

دور تک پھیلتی ہیں اور سطح ہموار ہو جاتی ہے۔ پرسکون عمیق گمبھیر اور ذخار سطح۔

قتیل کی نظموں میں معاشرہ، معاشرہ کا دیا ڈبے کلی اور ٹرمو آئل سب موجود ہے۔ سامراج "ضمیر" اور "جسموں کا بھنور" ایسی کئی نظمیں ہیں جن میں بڑے CONFLICT کی باتیں ہیں۔ اردو کے مضمون میں جب کبھی معاشرے کی بات آجائے تو یہ انسانوں سے علیحدہ کوئی پنجرہ یا کوئی قید خانہ نظر آتا ہے جس میں انسان کو رسم و رواج کی زنجیر سے باندھ کر تاڑ کر اور بند کر کے رکھا جاتا ہے۔ معاشرے کی ہیئت کذائی جو انسانوں کی آویزش اور آمیزش سے پیدا ہوتی ہے اس کی صورت نظر کہیں نہیں آتی جب معاشرے کی تصویریں قتیل کھینچتا ہے۔ وہ رسم رواج کے بندی خانے کی باتیں نہیں ہیں بلکہ انسانوں کے تال میل سے ان کی وفا اور بیوفائی ان کی خود غرضی اور ایثار پرستی سے پیدا ہونے والی گانٹھیں ہیں۔ پھر قتیل کو یہ بھی شوق نہیں کہ وہ ہر ڈرامے کا ڈراپ سین بنائے منطقی یا غیر منطقی طور پر المیہ یا طربیہ انجام کا فل اسٹاپ لگائے یہاں وہ مکمل طور پر شاعر ہے، زندگی کی طرح کسی ڈرامے کا کوئی انجام نہیں، کسی نظم کا کوئی مقطع نہیں۔ قتیل بھی اپنی نظم ختم کرتا ہے تو آپ کو دعوت دیتا ہے کہ باقی مضمون آپ اپنی طبع کے مطابق اس میں شامل کرلیں مجھے کوئی اعتراض نہیں وہ شاعر ہے

مکمل سوال ہے، تحریر ہے، وہ جس طرح سورج غروب، چودھویں رات کے چاند اور لہروں سے نکلی سیپی دیکھ کر حیران ہوتا ہے اسی طرح انسانی رابطوں سے جسموں کی گرم بازاری سے اور دل کی بدلتی کیفیتوں سے سراسیمہ ہے جس طرح کسی بچے کو نئے نئے کنچے ملتے ہیں تو وہ بار بار ان مدور شیشوں کو ہتھیلی پر رکھ کر اندر بل کھائے ہوئے رنگ دیکھتا ہے اس پر ان رنگوں کا سحر اور بھید نہیں کھلتا۔

قتیل کے پاس بھی کچھ کنچے جو اسے دل و جان سے عزیز ہیں لیکن ایک کنچا جس میں عورت کی شبیہہ کئی رنگوں میں ہے جو ہر رُت میں بدلتی ہے اور جس میں صبح و شام کا انوکھا اثر ہوتا ہے۔ یہ کنچا قتیل کی جان ہے شاعر لوگ کبھی کسی پر دل و جان سے فدا نہیں ہوتے۔ ان کے اندر فینٹسی اور DREAM FIGURE ہوتے ہیں۔ عاشق اور شاعر میں یہی فرق ہے کہ شاعر اپنے DREAM FIGURE کا پجاری رہتا ہے اور عاشق اپنے محبوب جیت لینے کے بعد اس کے در سے نہیں ہلتا۔ شاعر انسانوں میں اپنی فینٹسی کا روپ تلاش کرتا ہے اس لئے اسے بار بار تلاش کرنا پڑتی ہے۔ بار بار وہ شکست سے آشنا ہوتا ہے۔ انسان کا قد، روپ، سیرت عادات تو فیتے سے ناپی جا سکتی ہے لیکن DREAM FIGURE کنچے میں بل کھانے والی عورت کی طرح جام جمشید

کی طرح دنیا سے ملا ہوا اور کٹا ہوا ہوتا ہے اس لئے عاشق دکھ جھیلتا ہے زہر کا پیالہ پیتا ہے لیکن اپنی جگہ سے نہیں ہلتا کیونکہ وہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان سے محبت کرتا ہے ۔ شاعر دکھ جھیلتا ہے زہر کا پیالہ پیتا ہے اور ریگستان میں آوارہ پھرنے والی ریت کی طرح دور نزدیک سائیں سائیں کرتا رہتا ہے کہ اس کے خواب ہوا بن کر ریت اڑاتے ہیں۔

بات قتیل کی ہو رہی تھی قتیل کو بھی شبہ ہے کہ وہ عاشق ہے حالانکہ اس کی بنیادی خصوصیات شاعر کی ہیں ۔ اسے عورتوں کی باتیں محبوب ہیں اپنے کنبے سے بہت پیار ہے لیکن اس کے کنبے میں رنگ نہیں ٹھہرتے ۔ اس کا خیال ہے کہ کوئی عورت اسے جسموں کے بھنور سے نکال لے جائے گی ، گلابی آگ سے نجات دلائے گی ۔ وہ آم کے پیڑ تو لگاتا ہے لیکن کسی پھل پر اس کی مہر نہیں لگتی ۔ وہ عورت کی بے وفائی کا رونا روتا ہے اور آخر میں دل برداشتہ ہو کر ایسی نظم لکھتا ہے ——— "بیو لیو روتی رہو ———" عورت سے محبت کی یہ آخری حد ہے جہاں مرد عورت کے نقطہ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور رانجھا رانجھا کرتے آپے رانجھا ہو جاتا ہے لیکن اس تمام تر محبت کے باوجود وفا کی آرزو اور بے وفائی سے نفرت کے باوصف قتیل عورت سے محبت کرنے کی کیفیات بیان کر کے ہلکا پھلکا سا ہو جاتا ہے ۔ بات

فینٹسی سے شروع ہو کر نظم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ کینچارنگ بدلتا ہے، قتیل تحیر کی زد میں آجاتا ہے۔ پھر نظمیں بنتی ہیں اور بنتی رہتی ہیں۔ لوگ داد دیتے رہتے ہیں۔ کتابیں چھپتی رہتی ہیں۔

ہر کتاب کے چھپنے کے بعد، ہر نظم لکھ لینے کے بعد قتیل درماندہ ہو جاتا ہے تھک جاتا ہے اور سوچتا ہے،

کینچے میں رہنے والی عورت ہمیشہ ایک سی کیوں نہیں رہتی؟ رنگ کیوں بدلتی ہے؟ میں ہمیشہ نئی نظمیں کیوں لکھتا ہوں، پرانی نظم پر کیوں اکتفا نہیں کرتا؟ کیا میں ہمیشہ شاعر رہوں گا؟ کیا انسانی تعلقات کا کوئی تت نہیں نکل سکے گا؟ کیا سب کچھ ہو چکنے کے بعد بھی یہ ہنوز مارہے گا؟

★ ★

فارغ بخاری

تیسری قسم کا بچہ



سعادت مند بچے ایک ہی کھلونے سے کھیلتے کھیلتے سارا بچپن گزار دیتے ہیں۔ شریر بچوں کے لئے ادھر کھلونے آئے۔ اور ادھر توڑ پھوڑ کر نئے کھلونوں کا تقاضا شروع کر دیا۔ خاطر غزنوی کی خاصیت ان دونوں قسم کے بچوں سے جدا ہے وہ تیسری قسم کا ایسا بچہ ہے جو ایک کھلونے پر قناعت نہ کرتے ہوئے نت نئے کھلونوں کا متلاشی تو ضرور رہتا ہے لیکن انہیں توڑنے پھوڑنے کی بجائے شوکیس میں سجا کر رکھنے اور آنے جانے والوں سے اپنی ہنرمندی کی داد کا طالب ہوتا ہے۔

خاطر سے کم و بیش تیس برس پہلے میری ملاقات ہوئی تو وہ بچہ ہی تھا۔ عمر کے لحاظ سے نہ سہی ادبی طور پر ان دنوں وہ گھٹنوں چلنے کی مشقت سے گزر رہا تھا۔ شاید اس لئے اب جبکہ وہ ادبی طور پر بھی کل کا باپ بن چکا ہے اس کی ادبی صلاحیتوں اور نام و مقام کا قائل ہوتے ہوئے بھی وہ مجھے بچہ ہی لگتا ہے۔ ویسے اس میں بچوں کی بعض روایتیں اچھی

تک بحال ہیں۔ بعض شخصیتوں کی یہ خوبی ہے کہ وہ زندگی کے ہر اسٹیج میں بچے ہی لگتے ہیں۔ حتیٰ کے بڑھاپے کا سنگین اور سفاک دور بھی ان سے بچپنا نہیں چھین سکتا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ بڑھاپے میں انسان بچہ بن جاتا ہے۔ اغلباً ایسے ہی لوگوں کو دیکھ کر کہا ہوگا ورنہ ہر شخص میں یہ جوہر کہاں کہ وہ بڑھاپے کو بچپنے کی طرح گزارنے کا اہل ہو۔ اس عمر میں تو بقول جوش ملیح آبادی اپنی پہچان تک مشکل ہو جاتی ہے۔

کیا قہر ہے جب دیکھتا ہوں آئینہ۔ اپنے میں کوئی اور نظر آتا ہے۔

خاطر کے کمرے کی بے ترتیبی دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کسی بچے نے کھیلنے کیلئے دنیا کی بھر کی بیکار چیزیں جمع کر رکھی ہوں۔ کتابوں، رسالوں، اخباروں کے علاوہ پرانے ٹکٹوں کے فائل، پرانی ڈائریاں، پرانے کیلنڈر، کیمرے، تصویریں، مجسمے یہاں تک کہ اس کے نام آئے ہوئے خطوط کے ادبی لفافوں کا انبار بھی آپ کو مل جائے گا۔ اس طرح ہر فن مولا بننے کے لئے ان میں اس نے مصوری، فوٹو گرافی، شاعری، ڈراما نگاری موسیقی غرض ہر فن میں نہ صرف قسمت آزمائی کی ہے بلکہ برسوں جان کھپائی ہے اور بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ لیکن ابھی تک اس کے اندر کے قد آور فن کار پر کوئی جامہ فٹ نہیں آیا۔ پچھلے سال اس نے کہا تھا کہ اب سب کچھ چھوڑ کر صرف شاعری کو اپنا رہا ہے۔ لیکن اس کے ایک ہفتے بعد وہ ہند کو فلم قصہ خوانی میں اداکاری کے

جوہر دکھاتا ہوا پکڑا گیا۔

درصل وہ ایک ایسا سیماب صفت انسان ہے جو صرف بھاگ دوڑ کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اس کی زندگی میں ٹھہراؤ مطلق نہیں۔ اپنے درس و تدریس کے فرائض کے علاوہ وہ درجنوں ادبی و غیر ادبی اداروں کا صدر، سیکرٹری، کنوینر، مشیر یا کم از کم ممبر ضرور ہے۔ صبح سے شام تک مشین کی طرح کام کرنا اس کی محبوب ہابی ہے۔ لیکچرر کے علاوہ وہ یونیورسٹی میں پبلک ریلیشن افسر بھی ہے اور غالباً لیکچررز کلب کا سیکرٹری بھی ہے۔ کیونکہ اسے دعوتوں کا انتظام کرتا ہوا بھی پایا گیا۔ اور لیکچررز کے لئے حکومت سے رہائشی پلاٹوں کی زمین حاصل کرنے میں سرگرداں دیکھا گیا۔ اس کے انکار کے باوجود یہ سارے دھندے اس کے گلے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ اخلاقاً قبول کرنے کو مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے الیکشن میں ہمارے سیاستدان پبلک کے اصرار پر حصہ لینے کے لئے بے بس ہو جاتے ہیں۔ اس میں اتنی قوت کار ہے کہ انکار کے باوجود پانچ دس اور بھی ایسی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لئے ہر وقت مجبور ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ بلکہ ایک نہیں دو لطیفے یاد آ رہے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا وہ قصہ خوانی میں اپنے ایک دوست کی دکان پر بیٹھا تھا۔ دوست کسی کام سے اٹھ کر باہر گیا۔ اور جب

عادت دکانداری میں دلچسپی لینے لگا۔ اسی اثنا میں دکان کے باہر ایک شخص اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ خاطرؔ نے ایک ماہر دکاندار کی طرح پوچھا "کیا چاہیئے؟" وہ قریب ہو کر کہنے لگا۔ چاہیئے تو کچھ نہیں ایک بات پوچھتا ہوں۔ آپ کا کوئی بڑا بھائی ہے؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "کتنی عجیب بات ہے میرے بچے کا چینی کا پروفیسر ہو بہو آپ کی شکل کا ہے۔"

دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ اس کے ایک نئے شاگرد نے کلاس سے باہر خاطرؔ کو اردو میں بات چیت کرتے ہوئے دیکھا تو حیران ہو کر اپنے ساتھی سے کہنے لگا" اسے جانتے ہو یہ چینی ہے اور دیکھو کیسی صاف اردو بول رہا ہے۔"

چینی ڈیپارٹمنٹ کے تعلق سے بعض حضرات اسے واقعی چینی سمجھتے ہیں۔ وہ چینی تو نہیں لیکن اس کی باتوں میں چینی کی مٹھاس ضرور ہے۔ اس لئے چینی کی اس کمیابی کے دور میں اس کا دم غنیمت ہے۔ اس کی باتوں میں نہیں شاعری میں بھی ایک شیریں اور خوشگوار فضا ملتی ہے۔ خاطرؔ نے بڑے اُجلے گیت کہے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جذباتی ہونے کے باوجود شاعری میں اس کا لہجہ نرم اور کومل ہے، جیسے شبنم کی پھوار جیسے غنچے کے چٹکنے کی صدا جیسے ٹھنڈے صاف پانی کے جھرنے کی گنگناہٹ —— مصوری میں بھی اسے ہمیشہ ہلکے

رنگ ہی مرغوب رہے ہیں۔ اس کے مزاج اور فن کا یہ تضاد ناقابل فہم ہے۔ ویسے اس کی شاعری کے متعلق ابتدا ہی سے میری رائے ہے کہ وہ گیتوں کا شاعر ہے۔ اس کی نظموں، غزلوں میں بھی گیتوں ہی کا ذائقہ، نغمگی اور خوشبو ملتی ہے۔ وہ پھولوں اور خوشبوؤں کا شاعر ہے۔ وہ اب تک رنگا رنگ تتلیوں کے پیچھے بھاگتا رہا ہے۔ اس کا المیہ یہ ہے کہ خوبصورت تتلیاں ہمیشہ اس کی رسائی سے دور رہی ہیں اس المیہ کو اس نے جان کا روگ نہیں بنایا بلکہ ایک اونچے فن کار کی طرح اپنے فن میں سمو کر اس میں جاذبیت اور دلکشی پیدا کی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں اس کے فن کی تمام خوبیوں کا احاطہ کرنا میرے لئے ممکن نہیں احباب کی رائے ہیں وہ تمام فنون لطیفہ پر ہاتھ مارنے کے بجائے کسی ایک کو اپنا تا تو اس کی صلاحتیں نہ جانے کہاں جا کر دم لیتیں لیکن "کسی ایک چیز" کے متعلق ان کی رائے میں اختلاف ہے کوئی اسے مصوری کوئی فوٹو گرافی کوئی موسیقی اپنانے کا مشورہ دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں خاطر کا اصل میدان شاعری ہے۔ یہ اس کی طلسمی شخصیت کا جادو ہے کہ اس کے متعلق لوگ اتنی ساری خوبیوں کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن شاید وہ بھی جانتا ہے کہ ا ۔ صرف شاعری کرنی چاہیئے۔ ہاں منہ کا مزہ بدلنے کو کبھی کبھار کوئی دوسرا ذوق بھی پورا کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

خاطر کے قلم میں قوت ہے اور اچھی بات یہ ہے کہ وہ اس کا مصرف بھی جانتا ہے۔ دوسرے فنون میں دسترس رکھتے ہوئے بھی اب تک اس نے صرف شاعری ہی میں نام پیدا کیا ہے۔ اس کی شاعری کے ضمن میں میں نے پھولوں اور تتلیوں کا ذکر کیا ہے یہ اس کے بچپن کے وہ سہانے خواب ہیں جن کا تعاقب کرتے ہوئے عمر کے اس حصے میں آپہنچا ہے جس میں حسینوں سے قابل احترام رشتے قائم کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے یہ طویل تعاقب لڑکپن کی معصومیت اور ذہنی نیک چلنی کی علامتیں ہیں۔ اس کی یہ نیک چلنی خواہ مجبوری کے باعث ہی کیوں نہ ہو فنی نشو و نما کے لئے کوئی نیک فال نہیں تاہم خاطر کی شخصیت کو نکھارنے میں اس کے چہرے کی معصومیت کے عنصر کا بڑا عمل دخل ہے۔ اندر کا حال تو اللہ جانتا ہے۔ خدا کرے وہ اپنی طفولیت کی اس معصومیت کو محفوظ رکھ سکے اور اس کی وہ دائمی مسکراہٹ زندہ رہے۔ تاکہ ہم اس کی بعض بے ہودگیوں کے باوجود اسے ہمیشہ سویٹ چائلڈ کہتے رہیں۔

★ ★



گریزاں کا شاعر

سلیم بیتاب

جمیل یوسف کے مجموعۂ کلام "گریزاں" کے مطالعہ سے دو باتیں بڑی وضاحت سے سامنے آتی ہیں۔ ایک تو شاعر کا شوقِ سفر اور دوسرے اس کا ذوقِ جمال — شوقِ سفر اور ذوقِ جمال کا آپس میں اتنا قریبی تعلق ہے کہ اس کی کسی لمبی چوڑی تشریح کی ضرورت نہیں — مختصراً یوں سمجھیے کہ یہ دونوں جذبے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شوقِ سفر کو ذوقِ جمال ہوا دیتا ہے اور ذوقِ جمال کی تشفی شوقِ سفر سے بندھی ہے گریزاں کے صفحات ایک ایسے ہی مسافر کی نئی منزلوں کی داستان ہے جو خوبصورتیوں کا متلاشی ہے۔

ہر قدم پر اک نئی منزل کی خواہش ہے تجھے۔
اے دلِ آوارہ! اے پاگل! ذرا آہستہ چل۔

میں ایک عمر سے گردِ سفر کی زد میں ہوں۔
کٹا نہیں ہے ابھی تک مرا سفر کچھ بھی۔

جدھر دیکھتا ہوں مرے چار سو فاصلے ہیں
کہیں موڑ پڑتا نہیں ہے عجب راستے ہیں

رواں دواں ہیں شب و روز کے تعاقب میں

نہ منزلوں کی خبر ہے نہ جادہ رکھتے ہیں

کہیں بھی سائے میں رکنا ہمیں قبول نہیں

ہم اپنے شوق کی قیمت زیادہ رکھتے ہیں

شاعر کا سفر مسلم، مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس سفر کی نوعیت اور اسکی غرض و غائیت کیا ہے اور بقول شاعر

جمیل مجھ کو یہ کن فاصلوں نے گھیرا تھا۔

کہ ختم ہو نہ سکے عمر بھر سفر میرے۔

جہاں تک سفر اور فاصلے کی بات کا تعلق ہے تو ایسا لگتا ہے کہ شاعر کی فطرت میں ایک بڑی ناصبوری اور بے تابی موجزن ہے جو اسے کہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی جمیل کو کسی کی تلاش ہے اور کسی کا یہ لفظ میں بڑے وسیع معانی میں استعمال کر رہا ہوں۔ گہرا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس تلاش میں خوبصورت چہروں سے لے کر خوبصورت خوابوں، خوشیوں اور مسرتوں کی تمنا شامل ہے اس میں آئیڈیل چونکہ آسانی سے میسر آنے والی چیز نہیں لہذا جمیل کا سفر ہمیشہ جاری رہا ہے۔

شاید کسی مقام پر اس کا نشان ملے

اے شوق تا بحد نظر جانا چاہیے ؎

دور خوابوں کے جزیروں میں جو آتی ہے نظر

کب تلک اس روشنی کو دور سے دیکھا کریں

جانے میں کب سے اس کے تعاقب میں ہوں

اک جھلکی صدا ہے تمہارا بدن۔

اب جو نکلا ہوں ترے خواب لیے۔

تا بہ امکانِ نظر جاؤں گا

جمیل یوسف جن نقوشِ جمیل کی تلاش میں سرگرداں ہے اس کا ایک انسانی بلکہ نسوانی روپ بھی اس کے اشعار میں اپنے تمام خدوخال کے ساتھ موجود ہے

کہاں ہے زہرہ میں وہ شعلہ اس جبیں کا سا
کہاں ہے غنچے میں وہ بات اس دہن کی سی

اِک دامنِ نظر کہ بچانا محال ہے۔
اک شعلۂ بدن کہ لپکتا دکھائی دے

لذتِ دیدار کی اے ساعتِ رخشاں ٹھہر
پڑھ رہا ہوں میں ترے چہرے پہ کچھ لکھا ہوا

آج وہ حسنِ جواں حلقۂ آغوش میں ہے
رات تھم جائے مری عمر بسر ہونے تک

آؤ اپنے شوق بے پروا کو یوں رسوا کریں
ہر حسین سے کدے کا راستہ پوچھا کریں

کم ہو سکی نہ اس پہ بھی دیوانگی مری
میں تجھ کو ڈھونڈ کر بھی تجھے ڈھونڈتا رہا۔

دامنِ دل کو کھینچیں گے چہرے کئی
آشنا آشنا، اجنبی اجنبی

راہ چلتے سنبھالوں گا کیسے نظر
گھر سے نکلا تو پھر دل پہ قابو کہاں

جمیل یوسف حسین چہروں کے علاوہ حسین خوابوں کی تلاش میں سرگرداں

رہا ہے یہ سفر آج بھی جاری ہے اس سفر کی تکمیل کی اسے کوئی خواہش بھی نہیں۔ اور ایک سچے سفر پسند میں یہ خصوصیت یقیناً ہوتی ہے کہ وہ کسی مقام کو بھی اپنی منزل قرار نہیں دیتا کیونکہ کسی مقام کو منزل قرار دینے کا مطلب تو مسافر سے سفر کا رشتہ منقطع کرنا ہوا۔ اور یہ مسافر کی موت کے مترادف ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ گریزاں کا مسافر کہتا ہے۔

مجھے سکوں نہ ملے گا پہنچ کے منزل پر
مرے رفیق مجھے راستوں میں رہنے دے
ہجوم شوق کو منزل سے ہمکنار نہ کر۔
یہ نا تمام کسک خواہشوں میں رہنے دے

دراصل خواہشوں کی یہ نا تمام کسک ہی وہ تحریک اور توانائی فراہم کرتی ہے جو مسافر کو ہمیشہ رواں دواں رکھتی ہے اور جو منزل کی بجائے سفر کو ایک اعلیٰ تر قدر کا روپ بخشتی ہے۔ جمیل یوسف کا یہ اندازِ نظر اسے ہرجائی بنانے کا بھی ذمہ دار ہے اور بقول پروفیسر غلام جیلانی اصغر "وفاداری بشرطِ استواری" کسی خانہ زاد خادم کی خوبی تو ہو سکتی ہے مگر اس قسم کی STATIC LOYALTY کسی صحیح حسن پرست کے مذاق کی توہین ہے وہ تو ہر وقت خوب سے خوب تر کی تلاش میں حاتم طائی کی طرح سرگرداں رہتا ہے کیونکہ اس کی جستجو ایک نہ ختم ہونے والی مہم ہے

پروفیسر غلام جیلانی اصغر صاحب کا یہ تبصرہ اگرچہ جمیل کی حسن پرستی کے ضمن میں وارد ہوا ہے لیکن میرے خیال میں یہ تبصرہ جمیل کے مجموعی اندازِ نظر کے بارے میں بھی سو فی صد درست ہے۔ اب یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ شاعر جو ایک عمر سے ایک نہ ختم ہونے والے سفر پر رواں دواں ہے اس نے آج تک اس سفر سے کیا پایا ہے

اس سوال کا جواب گریزاں کے صفحات سے یہ ملتا ہے کہ شاعر کو اس سفر سے خوابوں کی

شکستِ یادوں کے زخم در و بام کی ویرانی آبادیوں پہ سناٹے اور تنہائیوں کے زہر کی سوغات ملی ہے۔ سفر کی ان عطاؤں کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

یہاں ہر ایک سفر رائیگاں دکھائی دے
وہی زمین وہی آسماں دکھائی دے
انہی سے پاؤں مرے عمر بھر رہے زخمی
بکھر گئے جو کئی خواب ٹوٹ کر میرے۔
وہ آندھیاں ہیں کہ سورج بھی بجھ کے رہ گیا
نہیں نظر میں بجز حسرتِ نظر کچھ بھی۔
یہ کیا کہ عالم امکاں میں جس طرف جاؤں۔
فقط بکھرتی رُتوں کا سماں دکھائی دے

جمیل یوسف کے ان اشعار میں بکھرتی رُتوں کے جس بھیانک اور دلخراش منظر کو پیش کیا گیا ہے اس میں ہمارے ماضی قریب کے ان تمام المناک واقعات و حوادث کی پرچھائیاں موجود ہیں جنہوں نے ملک کے ہر در و دیوار کو آسیب زدہ سا بنا کر رکھ دیا ہے۔ گرمیزاں میں ہماری ویرانیوں اور پریشانیوں کی تصویریں بھی اس کثرت سے موجود ہیں کہ انہیں جوڑ کر ہم پاکستان کا ایک بہت بڑا تصویری خبرنامہ تیار کر سکتے ہیں۔

کچھ ایسے دھوپ سے خالی نگر ہمارے ہوئے
کہ تیرگی میں نہاں بام و در ہمارے ہوئے
لہو کی پیاسی ہے ساحل کی نامراد ہوا!
مسافروں کو ابھی کشتیوں میں رہنے دے
انہی اداس فضاؤں سے دوستی کر لیں

کہ اب تو ٹوٹ کے جانے کا مرحلہ بھی گیا!

جمیل کا احساسِ ویرانی کئی ایک چیزوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے اس میں کچھ تو ROMANTIC FRUSTRATION...... کا عنصر شامل ہے جسے ہم خالص شاعرانہ تنہائی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور جو غالباً ہر حساس شخص اور خصوصاً فنکار کا مقدر ہوا کرتی ہے۔ مگر جمیل یوسف کے ان ذاتی تجربات و احساسات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاثرات ذاتی ہونے کے باوصف ایک عمومیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ تجربات ہم سب کی واردات ہو سکتے ہیں۔ جمیل یوسف کا ایک شعر ہے

اے مرے دوستو قریب آؤ!

اپنی وحشت سے ڈر رہا ہوں میں

یہ شعر جس عجیب و غریب نفسیاتی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے وہ ہم سب کا ذاتی آشوب بن سکتی ہے کیونکہ بعض اوقات ہمارا اپنا احساس ہی ہمارے سامنے ایک خوفناک دشمن بن کر آن کھڑا ہوتا ہے اور پھر وحشی سوچیں ہمارا گھیراؤ کر لیتی ہیں جمیل کے ان ذاتی محسوسات پر جب معاشرے کے حوادث اور ماحول کا کرب بھی اثر انداز ہوتا ہے تو احساس کی یہ آگ کچھ اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

نہ یارِ لطف پہ مائل نہ شہر درد شناس

کہاں یہ ہم دلِ امیدوار لے کے چلے!

آئینوں پر ہی کچھ نہیں موقوف

ہر تعلق شکستہ تر ہے یہاں!

بند دریچے صف بستہ گم سم دیواریں

شہر کی ویرانی سے مجھ کو خوف آتا ہے

ہے اور یہی آج کے دور کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

ع کہ نہیں گریز پا ہیں تو خوشبو بہانہ جو

اے کاش کوئی اپنا شناسا دکھائی دے
جانے لوگوں کی آوازیں کیا کہتی ہیں
جانے ہر جانب کیوں گھرا سناٹا ہے
کھوئی کھوئی سی مضمحل چپ چاپ
زندگی ہے کہ شامِ تنہائی

جمیل نے ان اشعار میں جس کھوئی کھوئی چپ چاپ اور مضمحل سی زندگی کا نوحہ پڑھا ہے یہ آج کے دور کی خاص دین ہے آج کا ہر شاعر ایک شدید احساس تنہائی کا شکار ہے۔ یہ احساس تنہائی آج کی غزل کا مرکزی خیال بن گیا ہے۔ اس المیہ کے پیدا کرنے میں کئی ایک نفسیاتی معاشرتی اور اقتصادی مسائل کا ہاتھ ہے ان مسائل کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ ہم سب بقائمی ہوش وحواس اس عذاب سے گزر رہے ہیں۔ آج کی صنعتی، مشینی اور شہری زندگی کے رگڑے نے ذہن کے تاروں کو اس قدر حساس بنا دیا ہے۔ کہ اب شعروں میں شاعروں کی باقاعدہ چیخیں سنائی دینے لگی ہیں۔ شعر و فن کے بعض سخت جان نقادوں کے نزدیک شاعری کا یہ رجحان شاید صحت مند ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب کسی انسان یا قوم سے دھوپ اور روشنی گریزاں ہو۔ محبت اور پیار کی شیرینی گریزاں ہو غرض زندگی کی کئی ایک معصوم مسرتیں گریزاں ہوں۔ تو پھر شام کی نوا میں اگر نوحہ گری کا عنصر شامل ہو جائے۔ تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ جمیل یوسف کا مجموعہ گریزاں حسن خوشبو کے اس گریز کی داستان



انور سجاد

منصور قیصر

انور سجاد ان چند لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ اللہ واسطے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے اللہ واسطے میں نے اس لئے کہا ہے کہ آج ہم کسی کے ساتھ خلوص ، قربت ، شفقت ، نیکی ، ہمدردی دکھ درد میں شرکت پیار اور محبت بے مقصد بے لوث ، اور بلا مفاد نہیں کرتے ہم اخلاق اور انسانیت کی بنیادی قدروں کو مادی تقاضوں اور تجارتی بنیادوں پر ہی پرکھتے ہیں ہم تجارتی اور مشینی فضا میں سانس لیتے ہوتے ایسے حیوان ناطق ہیں جنہوں نے روشن تہذیب کا بہروپ بدلا ہوا ہے۔

یہ کمرشل دور ہے ہم اپنے تمام انسانی رشتوں کو بھی انہی پیمانوں سے ناپتے اور تولتے ہیں جن سے کپڑا۔ دودھ کوئلہ ۔ فولاد ۔ پٹرول اور سوئی گیس ناپے اور تولے جاتے ہیں اس لئے ایسے لوگ معاشرے میں انتہائی غیر معمولی نظر آتے ہیں جن سے غیر تجارتی پیار کرنے کو جی چاہتا ہے اور انور سجاد ان میں سے ایک ہے میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے جریدہ "کیمکول" میں کہانیاں لکھنی شروع کی تھیں اور گا ہے گا ہے وہ اپنی کہانیاں حلقہ

ارباب ذوق لاہور میں بھی پڑھا کرتا تھا مگر وہ مجھ سے کئی برس بعد متعارف ہوا ممکن ہے وہ مجھے اب بھی جانتا ہو کیونکہ میں نے اپنی دوستی کا کبھی اشتہار نہیں دیا۔

انور سجاد نے ابتدا سے ہی افسانے میں تکنیکی تجربات شروع کر دیے اور اب سے تقریباً پندرہ برس قبل ہئیت اور روایت سے بغاوت کوئی بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ویسے بغاوت کو کبھی فراخدلی سے قبول نہیں کیا جاتا سننے والوں اور پڑھنے والوں نے اس کی حوصلہ شکنی بھی کی مگر اس میں چھپے ہوئے ایک جینئس فن کار نے کسی کی بھی پروا نہ کی مجھے اس زمانے میں ادب ودب اور تکنیک ٹکنیک کا پتہ نہیں تھا شاید اب بھی نہ ہو مگر ایک بات جس نے مجھے انور سجاد کے ذہنی طور پر قریب کر دیا وہ تھی اس کے افسانوں کا بنیادی موضوع! انسانی ہمدردی ایک ایسی ہمدردی جس کا ایک مریض اپنے معالج سے طلب گار ہوتا ہے انور سجاد نے ہر اس مریض سے نہ صرف ہمدردی کی بلکہ اس کا علاج بھی کرنا چاہا جو ذہنی، جسمانی معاشرتی تہذیبی طبقاتی فکری اور سیاسی امراض میں مبتلا تھا تخلیقی پراسس میں اس کا رویہ اب بھی یہی ہے ہر نوع کا مریض اس کے فن کا موضوع ہے وہ صحت مند فضا میں رہنے کی خواہش رکھتے ہوتے دوسروں کو بھی ایسی فضا میں دیکھنے کا آرزومند ہے بلکہ اس کے لئے جو بھی کرتا ہے۔

اصل میں انور سجاد خود ایک مجسم جدوجہد ہے وہ کہیں بھی ٹھہراؤ جمود اور مزاحمت کا قائل نہیں اس کا مزاج سیماب وار ہے وہ ہر اس عمل سے دور بھاگتا ہے جس سے اوراکتاہٹ پیدا ہونے کا خدشہ ہو دیکھنے

دالے کو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ زندگی میں فاشزم کا قائل ہو
وہ بہت کم مدت میں بہت زیادہ کام کرنے کا عادی ہے اس سے کہیں
یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس کا ذہنی رویّہ بھی کمرشل ہے اور وہ بھی ادب و
ثقافت کے ان بائیس اجارہ دار خاندانوں میں سے ہے جو محدود سرمایہ
کاری سے سو گنا زیادہ منافع کما رہے ہیں بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے
کہ اس کے فکری سوتے اتنی شدت سے پھوٹتے ہیں کہ وقت کا ضیاع
کئے بغیر انہیں جلد از جلد تخلیقی پراسس سے گزار دیتا ہے یہی وجہ ہے
کہ وہ اپنے جذبے کے اظہار کے لئے مختلف ذرائع اختیار کرتا ہے جن میں
افسانہ ڈرامہ، اداکاری اور مصوری شامل ہے بلکہ اس کا اپنا تو یہ بھی
کہنا ہے کہ وہ اپنے میڈیکل پروفیشن کے ذریعے بھی اس تخلیقی جذبے
کی تسکین کرتا ہے شاید اس کارن اس کے مریضوں کا ایک وسیع حلقہ
ایسا ہے جو اس کے والد گرامی کی بجائے صرف اس سے اپنا علاج کروانا
پسند کرتا ہے اور اس حلقہ میں بڑھاپے سے خوف زدہ بیگمات کی تعداد
سب سے زیادہ ہے مجھے انور سجاد ہمیشہ ایک چھلاوہ معلوم ہوتا ہے
پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے دوستوں کو اس کا فون آئے گا کہ میں کلینک سے
بول رہا ہوں تم چائے کا آرڈر دو میں پہنچ رہا ہوں ادھر بیرا چائے
لا کر رکھے گا ادھر انور سجاد انگلی میں چابیاں گھماتے ہوئے اوّ دو ایک
دوستوں کو موٹی گالی دیتے ہوئے داخل ہو گا پھر خوب خوش گپیاں ہوں
گی جی بھر کر ہنسے گا اور پھر کہنے لگے گا کہ تم لوگ چائے اور منگواؤ میں ابھی
آتا ہوں اس کے کوئی پندرہ منٹ بعد فون آئے گا کہ میں گھر گلبرگ میں ہوں

اور بیوی کو شاپنگ کروانے جا رہا ہوں دو ایک گھنٹے بعد فون آئے گا کہ وہ ریڈیو کے ایک ڈرامہ کی ریہرسل کرنے کے بعد ٹیلیویژن اسٹیشن، پر اپنے ڈرامے کا آخری سین لکھا رہا ہے اور اس کے بعد کسی اور ڈرامے کی فرسٹ ریہرسل کرے گا بعد ازاں ٹیلیویژن اسٹیشن فون کر کے پوچھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ کلینک چلا گیا ہے وہاں فون کرنے پر خود ہی بولے گا کہ جونہی اباجان نے چھٹی دی میں فوراً پہنچ جاؤں گا پھر وہ ہر اس جگہ پہنچتا ہے جہاں جہاں اس نے وعدہ کیا ہوتا ہے بلکہ اپنے مہمان دوستوں کو رات کے ساڑھے گیارہ بجے مزنگ چوک میں تکے کباب کھلانا اور انہیں ریلوے سٹیشن پر پہنچانا بھی نہیں بھولتا وہ گھر، دوست، کلینک کی تمام ذمہ داریاں پوری کرنے کے ساتھ ساتھ تصویریں بنانے افسانے اور ڈرامے لکھنے ریڈیو، ٹیلیویژن اور سٹیج پر ڈرامے کرنے اور ادبی محفلوں میں بحث کرنے کا وقت بھی نکال لیتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس میڈیم سائز بوتل میں یا تو کوئی جن چھپا ہوا ہے یا پھر یہ منگلا ڈیم کی طرح ملٹی پرپز واقع ہے۔

ایک بار میں نے اس سے کہا کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جن کے لئے لگژری نہیں بلکہ بنیادی ضرورت ہے تو ہنس کر کہنے لگا مگر میں تو اسے مجبوری سمجھتا ہوں میں نے پوچھا "وہ کیسے" وہ بولا ہم لوگ گلبرگ میں رہتے ہوئے بھی گلبرگین نہیں بن سکے ہمارا ابھی تک ذہنی رشتہ اندرون لاہور سے ہے یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنا کلینک چونا منڈی سے منتقل نہیں کیا
کہنے لگا کار مجھے گلبرگ میں رہنے والے مریضوں کے لئے خریدنی

پڑی ایک بار ایک نبگلہ میں ایک بیگم کو دیکھنے سائیکل پر گیا تو اس نے یہ کہہ کر علاج کروانے سے انکار کر دیا کہ میں کسی ایسے ٹٹ پونجیے ڈاکٹر سے علاج کروانے کے لئے تیار نہیں جس کے پاس کار تک نہیں۔ لہٰذا مجھے اپنے آپ کو اچھا معالج ثابت کرنے کے لئے کار خریدنی پڑی۔

"خود خریدی ہے یا ابا جان والی ہی ہتھیالی میں نے پھر پوچھا"

"وہ بولا" ہتھیانے کا ارادہ تو تھا مگر ابا جان نے صاف صاف کہہ دیا تم کماؤ تے کار لو اور پھر اس کار کے لئے مجھے ٹیلیویژن پر "کہانی کی تلاش" کی سیریز شروع کرنی پڑی۔

انور سجاد اگر فن کار نہ بھی ہوتا تب بھی وہ اپنے احباب میں اتنا ہی محبوب ہوتا جتنا اب ہے انور سجاد دوست پرست ہے تعلقات برقرار رکھنے میں انتہائی دیانت دار ہے دوستوں کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ سمجھتا ہے منافقت اور بدخواہی سے اسے شدید نفرت ہے پیار کا اس قدر خواہش مند ہے کہ ہر نئے ملنے والے سے فوراً یوں بے تکلف ہو جاتا ہے جیسے اس کا برسوں سے دوست ہے اس میں یقیناً بہت سی خرابیاں اور کمزوریاں بھی ہوں گی آخر وہ بندہ بشر ہے لیکن میں اپنے عجز کا اظہار کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا کہ ہر ممکن کوشش کے باوجود میں اسکی کسی کمزوری یا خرابی کی نشاندہی کرنے کے قابل نہیں ہوا میں نے اس کے ہر ملنے والے کی زبان سے بھی اس کے خلاف کوئی گلہ شکوہ نہیں سنا اس کے برعکس اسے اپنے دوستوں سے ہزاروں شکوے ہیں لیکن وہ شکوے بھی کسی سے نہیں کرتا اور وہ اپنے تمام دکھوں کے اظہار کے لئے اپنے فن کو وسیلہ بنا لیتا ہے یہی ایک بڑے فن کار کی خوبی ہے اور اس خوبی کا نام انور سجاد ہے۔



آغا گل

ایوب صابر

مجھے ایک پُرکشش عنوان کی ضرورت تھی۔ دو تین عنوانات کو رد کرنے کے بعد مجھے دو اور عنوانات سُوجھے، ایک "خان لالہ" اور دوسرا "آغا گل" آذر صاحب گھر میں اپنی دو ناموں سے مشہور تھے۔ ہمشیرہ اُن کو "خان لالہ" کہتی تھیں اور اُن کے طوطے اُن کو "آغا گل" کہتے تھے۔ آذر صاحب کیساتھ اُن کی ہمشیرہ اور طوطوں کی محبت بے مثال تھی اور ان دونوں کے لئے میں نے اُن کو ہمیشہ فکر مند پایا تھا۔ وہ اُن ادبی مجالس میں شریک ہونے سے عموماً گریز کیا کرتے تھے جو رات کو منعقد ہوتی تھیں اور رات گئے تک جاری رہتی تھیں۔ وہ رات کے وقت گھر میں اپنی ہمشیرہ اور طوطوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جب تک اُن کی والدہ زندہ رہیں اُن کا ادبی ربط ہم سے دن کے علاوہ رات کو بھی قائم رہا۔ والدہ کی وفات کے بعد انہوں نے رات کو گھر سے نکلنا بند کردیا تھا۔ وہ فطرتاً آزاد تھے، مگر وقت نے اُن کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی تھیں اور ان زنجیروں کو وہ توڑ نہیں سکتے تھے، تو میں عنوان کی بات کر رہا تھا "خان لالہ" اچھا عنوان ثابت

ہو سکتا تھا۔ اس عنوان سے بے پناہ محبت اور وفا کی خوشبو بھی آرہی تھی مگر مجھے "آغا گل" اس سے کہیں زیادہ اچھا لگا جب میں نے یہ سوچا کہ آذر کے جنازے میں وہ لوگ بھی شریک نہیں ہوئے جو اُن سے دوستی کا دم بھرتے تھے تو میں مایوس ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ جب طوطے انسانوں سے زیادہ وفادار ہیں تو میں آذر پر اپنے مضمون کا عنوان وہ کیوں نہ رکھوں جو اُن کے طوطوں کو مرغوب تھا اور اب تک اُن کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے

"آغا گل" کی سُرخی جمانے کے بعد جب میں نے آگے بڑھنے کے لئے اپنے قلم کی نوک کو تیز کیا۔ تو اس سوچ میں پڑ گیا کہ آذر صاحب کے بارے میں کیا لکھوں۔ آذر صاحب کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مین ان کو جانتا ہوں اور پہچانتا بھی ہوں وہ میرے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے ہیں۔ مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب میں سکول کا ایک طالب علم تھا اور آذر سرحدی کوہاٹ کے مشاعروں میں بڑی تمکنت سے غزل سرا ہوا کرتے تھے۔ وہ دِن بھی یاد ہیں جب حالات نے مجھے دوسری جنگِ عظیم کی بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ اور آذر سرحدی بمبئی میں فلمی دُنیا کی خاک چھان رہے تھے۔ وہ دَور بھی یاد ہے جب آذر صاحب بمبئی سے مایوس ہو کر کوہاٹ لوٹ آئے تھے اور اپنے مستقبل کے بارے میں کاغذی خاکے بناتے رہتے تھے، اور ان خاکوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کبھی نہ کبھی مجھے بھی یاد کر لیا کرتے تھے۔ وہ عہد بھی یاد ہے جب آذر صاحب نے

اپنے بنائے ہوئے کاغذی خاکوں کو پھاڑ کر پھینک دیا تھا اور پبلک سکول میں بچوں کو پڑھانے لگے تھے اور وہ منحوس گھڑی بھی یاد ہے۔ جب میں نے آذرؔ صاحب کی ناگہانی موت کی خبر سُنی تھی اور مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ مگر آج میں ماضی کے ان واقعات کو موضوعِ بحث نہیں بناؤں گا بلکہ صرف اُن کی ہمشیرہ اور اُن کے طوطوں کے بارے میں ہی باتیں کروں گا۔

جیسا کہ اُوپر بیان کر چکا ہوں۔ آذرؔ صاحب اپنی ہمشیرہ اور اپنے طوطوں کے لئے اکثر فکر مند رہتے تھے اور اُن کی یہ خواہش تھی کہ اُن کی ہمشیرہ اُن سے پہلے ہی مر جائے۔ بظاہر اُن کی یہ خواہش گری ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر آپ یقین کریں آذرؔ مرحوم کی اس خواہش میں گراوٹ کا شائبہ تک موجود نہیں ہے، وہ تو محض اِس لئے اپنی موت سے پہلے اپنی ہمشیرہ کی موت کے خواہشمند تھے کہ اُن کو بے یار و مددگار زندہ چھوڑنا اُن کو منظور نہیں تھا۔ سو آج کے اِس ماتمی اجلاس میں یہ اعلان کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آذرؔ مرحوم کے بعد اُن کی ہمشیرہ بے یار و مددگار نہیں ہے بلکہ ایک بھائی کے بچھڑنے کے بعد اُن کے کئی بھائی پیدا ہو گئے ہیں، اور یہ تمام بھائی اتنے بے غیرت ہرگز نہیں ہیں کہ آذرؔ کے بعد اُن کی خبر گیری کے فرض سے غافل رہیں گے اور اُن کو زمانے کی سختیاں جھیلنے کے لئے تنہا چھوڑ دیں گے۔ اگر میری آواز اُن تک پہنچ رہی ہو تو خوش ہو جائیں کہ جب تک آذرؔ زندہ تھے اُن کا صرف ایک بھائی تھا لیکن اُن کی موت کے بعد اُن کے بیسیوں

بھائی اُن کے بارے میں بالکل اسی انداز سے سوچ رہے ہیں جس انداز سے خود آذرؔ سرحدی سوچا کرتے تھے۔

اس یقین دہانی کے بعد اب میں آذرؔ سرحدی کے اُن طوطوں کی طرف آتا ہوں جو انسانوں سے زیادہ وفادار ثابت ہوئے ہیں اور جن میں سے ایک نے آذرؔ صاحب کے سوگ میں کھانا پینا تک ترک کر دیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آذرؔ صاحب اس طوطے کو اپنے ہاتھوں سے چُوری کھلایا کرتے اور آج جب اس دنیا میں اِسس طوطے کو چُوری کھلانے والا ہاتھ موجود نہیں ہے تو یہ طوطا انسانوں سے زیادہ فکرمند ہے اور چُوری کھانے سے اکثر گریز کرتا ہے۔ اِس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ طوطا ایک بھٹکی ہوئی رُوح کی طرح اُسی کمرے کا طواف کرتا رہتا ہے جس میں آذرؔ مرحوم اُس کو چُوری کھلایا کرتے تھے اور اُس کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ جب آذرؔ صاحب گھر میں داخل ہوتے تھے تو یہ طوطا "آغا گل" "آغا گل" کہہ کر اُن کا استقبال کیا کرتا تھا۔ اور جب آذرؔ صاحب اپنے کمرے میں داخل ہوتے تھے تو یہ طوطا بھی اُن کے تعاقب میں وہاں پہنچ جایا کرتا تھا اور یہ سوچ کر خوشی سے چہچہانے لگتا تھا کہ اب اُسے چوری کھلائی جائیگی۔

آج آذرؔ صاحب کے گھر میں اُن کو "خان لالہ" کہنے والی ہمشیرہ موجود ہے اور "آغا گل" کہنے والا طوطا بھی۔ مگر میں آپ سب سے پوچھتا ہوں کہ آپ سب نے مل کر ایک دُکھی بہن کے "خان لالہ" اور

ایک وفادار طوطے کے "آغا گل" کو منوں مٹی کے نیچے کیوں دفن کر دیا ہے۔ اور اگر آپ سب نے سازش کر کے آذر سرحدی کو منوں مٹی کے نیچے دفن کر ہی دیا ہے تو اُن کے بعد اُن کی دُکھی بہن اور وفادار طوطے کے مستقبل کے بارے میں آپ کے پاس کیا پروگرام ہے۔ کیا آپ ان دو دُکھی اور تڑپتی ہوئی لاشوں کو بھی منوں مٹی کے نیچے دفن کرنا چاہتے ہیں یا اُن کو زندہ رکھنے کا کوئی پروگرام بنا رہے ہیں اگر آپ کے پیشِ نظر ایسا کوئی پروگرام ہے تو اُسے آج کی محفل میں کھل کر بیان کر دیجئے۔ تاکہ اُن کی دُکھی بہن اور وفادار طوطے کو کم از کم یہ تسلّی تو ہو جائے کہ وہ خدا کی اس وسیع و عریض دنیا میں تنہا اور بے سہارا نہیں ہیں

★ ★ ★



ایک پُر بہار شخصیّت

عذرا اصغر

مجھ میں ایک خامی نمایاں ہے۔ ویسے خامیاں تو بہت سی ہوں گی۔ سب میں خامیاں ہوتی ہیں۔ مگر اپنی خامیاں کسی کو نظر نہیں آتیں اور مجھ سے اپنی یہ خامی چھپائے نہیں چھپتی کہ ہر کام کی بلا سوچے سمجھے حامی بھر لیتی ہوں۔ کسی نے کہا "سوئیٹر بن دو"۔ میں تیار۔ کسی کی بچی کا فلیپر یا کرتا سینا ہے میں کمربستہ۔ گھرداری کے بکھیڑوں میں پھنسے، آرام کا لمحہ میسر نہ ہو مگر کسی کے کام کو انکار کی ہمت مجھ میں نہیں۔ گھر والے میری اس عادت سے چڑتے ہیں۔ میرے بچے جھگڑتے ہیں۔ میں خود بھی کبھی کبھی الجھتی ہوں۔ کام سے نہیں۔ گھر والوں کے ٹوکنے سے۔ مگر اپنی عادت کی یہ خامی میں دور نہیں کر سکی۔ شاید اس لئے کہ یہ عادت میری فطرت کا حصہ ہے اور فطرت بدلنا انسان کی طاقت سے باہر ہے ——— اس خامی کے علاوہ ایک اور بھی خامی مجھ میں ہے اور وہ ہے افسانہ لکھنا ——— ہزار بکھیڑوں کے باوجود نہ افسانہ لکھنا چھوٹتا ہے اور نہ افسانہ پڑھنا باورچی خانے میں کھڑے، دال کی پڑیا پر کوئی ادھورا افسانہ نظر آجائے

تو پڑھوں گی ضرور، میری متذکرہ خامیوں کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ میں یہاں اس محفل میں آپ کے سامنے پشتو زبان کی اس جانی پہچانی مصنفہ کے افسانوی مجموعہ پر اپنی رائے پیش کرنے آگئی ہوں جس کا نام زیتون بانو ہے۔

تاج سعید نے کتاب "شیشم کا پتا" بھی اور لکھا کہ آپ مضمون لکھیں گی۔"

میں نے اپنی لباط پہچانے بغیر مضمون لکھنے کا فیصلہ کر لیا پھر یوں ہوا کہ ایک تقریب میں اسرار زیدی ملے کہنے لگے: "بانو کی کتاب پر تقریب کر رہے ہیں۔ آپ مضمون پڑھیں گی؟" حسبِ عادت میں نے حامی بھر لی۔ پھر اکر سوچا ۔۔۔ تو معاملہ خاصا کٹھن لگا۔ لکھنا نہیں پڑھنا ۔۔۔۔ میں کہ نہ پیشہ ور تنقید نگار رہوں اور نہ تنقید کی ضخیم، بوجھل کتابیں پڑھنے کا مجھے شوق ہے۔ سچ پوچھئے تو ہیر پھیر کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں اور لفظوں کا ہیر پھیر تو اچھے اچھوں کو الجھا دیتا ہے۔

سو خواتین و حضرات آپ مجھ سے کسی نصاب کی کتاب کا کوئی بھاری بھرکم پیرا سننے کی ہرگز توقع نہ رکھئے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں ایسی تقریبات کا دستور ہے کہ اگر مقالہ پڑھنے والے سیدھے سبھاؤ، صاحبِ کتاب سے اپنی عقیدت، اپنی محبت کا اظہار کر ہی دیں تو بعض صاحبِ صدر قسم کے لوگ کتاب کے ساتھ ساتھ صاحبِ کتاب اور مقالہ نگاروں پر بھی ایسی کڑی تنقید کرتے ہیں

کہ سامعین کے بھی ہوش اڑ جاتے ہیں اور پھر پورا مجمع جو کہ پڑھنے والوں کو دل کھول کر داد دے چکا ہوتا ہے۔ اپنی کم علمی پر ——— حیران احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے لگتا ہے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر اس تقریب میں مضمون پڑھنے پر مجھے تشویش لاحق تھی لیکن جب رحیم گل صاحب سے معلوم ہوا کہ اس خوبصورت تقریب کی صدارت بانو قدسیہ کر رہی ہیں تو مجھے اطمینان ہوا کہ وہ بھی ہماری طرح بہرحال ایک عورت ہیں۔ کچن میں کھڑے ہو کر کھانا پکانے اور کہانیاں لکھنے والی عورت ——— زیتون بانو بھی ایک ایسی ہی عورت ہے جو کھانا پکاتی ہے۔ کپڑے دھوتی ہے۔ بچوں کی پرورش کرتی ہے اور دوسروں کے بچوں کو علم کی روشنی سے بہرہ ور کرتی ہے اس کے ساتھ ہی وہ شاعری کرتی ہیں، ڈرامے لکھتیں ہے اور کہانیاں تخلیق کرتی ہے آج اس تخلیق کار کو دادِ تحسین پیش کرنے کے لئے آپ سب کے ساتھ میں بھی حاضر ہوئی ہوں۔

کوئی ڈھائی برس پہلے کا ذکر ہے۔ جب بانو سے ملنے میں ان کے گھر گئی تو بانو کسی کام میں مصروف تھیں تاج سعید جو کہ خاصے کم سخن واقع ہوئے ہیں۔ ذرا جھجکتے ہوئے بولے "تشریف رکھئے بانو ابھی آتی ہیں"۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتیں یوں ملیں جیسے سدا کی شناسائی ہو بولیں"۔ معاف کیجئے گا آپ کو انتظار کرنا پڑا میں کپڑے دھو رہی تھی"۔ میرے میاں اور تاج سعید پر تکلف اور رکھ رکھاؤ والی جی ہاں اور جی نہیں

قسم کی گفتگو میں مصروف تھے۔

اور بانو بڑی بے تکلفی اور خوش خلقی سے نت نئے موضوعات پر مجھ سے باتیں کر رہی تھیں جو کہ خالصتاً گھریلو قسم کی تھیں اور میں محویت اور محبت سے انہیں سن رہی تھی۔ ان کا یوں روانی سے بولنا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں خاموش طبع تو نہیں ہوں مگر اس دن مجھے بولنے کی مہلت نہ ملی پھر مجھے یاد آیا کہ "دوسروں کا دل جیتنے کے لئے ان کی گفتگو میں دلچسپی لو" سو میں نے اپنے نہ بولنے کا غم بھلا دیا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی جو دنوں تک یاد رہی اور آج بھی اس کی خوشگواری میرے دل میں موجود ہے۔ ان سے دوسری ملاقات میرے گھر پر ہوئی۔ پہلے سے زیادہ خوشگوار اور بے تکلف ــــ چلتے ہوئے انہیں "منی پلانٹ" کا پودا پسند آ گیا۔ تاج سعید صاحب حسبِ عادت جھجکے۔ انہیں منع کیا سفر کی طوالت کا خوف دلایا۔ مگر میرے اصرار پر انہیں وہ تحفۂ درویش قبول کرنا ہی پڑا۔ مجھے یقین ہے وہ پودا آج بھی ہرا ہو گا کیونکہ محبت کا پودا کبھی مرجھاتا نہیں۔

بانو کی سب سے پہلی کہانی جو میں نے پڑھی وہ "ننکئی" تھی۔ "ننکئی" پشتو میں شاید نتھ کو کہتے ہیں یا ناک کی لونگ کو۔ میں بہرحال پشتو نہیں جانتی۔ یہ مجھے کسی نے بتایا تھا۔ افسانہ پڑھنے سے بھی پتہ چلتا ہے "ننکئی" ایک اثر انگیز معاشرتی افسانہ ہے جس کا ترجمہ رحیم گل نے کیا تھا۔ رحیم گل پشتو ادب اردو میں ترجمہ خوب کرتے ہیں۔ مگر

اردو اور پنجابی کے ساتھ شاید انہوں نے کبھی ایسا سلوک نہیں کیا ویسے ترجمہ کرنا بھی ایک فن ہے۔ کسی زبان کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اور اس کی پوری صحت اور حسن کے ساتھ منتقل کرنا یقیناً قابل قدر فن ہے۔ یہاں مجھے اس کا اعتراف کر لینے دیجئے کہ رحیم گل کو یہ فن آتا ہے۔

"ننگی" افسانہ زیر موضوع کتاب میں "دوشیزگی کی نشانی" کے عنوان سے چھپا ہے۔ اس کے علاوہ بطورِ خاص جو افسانے مجھے اچھے لگے وہ "ایک آنے کا بٹیا" "نچھاور" "شیشم کا پتہ" اور کرم خوردہ ستون" ہیں۔ کرم خوردہ ستون کس معاشرے میں نہیں ہوتا۔ وہ معاشرہ سندھی ہو۔ پنجابی ہو یا پختون ہو۔ کرم خوردہ ستون ہر جگہ اور ہر معاشرے میں موجود ہے۔ ضرورت تو صرف دیکھنے والی آنکھ کی ہے اور دیکھنے والی آنکھ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ دوسروں کے دل میں اندر تک جھانکنے اور ان کے دکھوں پر آنسو بہانے والی آنکھ تو قدرت کا عطیہ ہے جو قدرت کی طرف سے منتخب لوگوں کے ہی حصے میں آتی ہے۔ انہی انتخاب کردہ لوگوں میں ایک نام زیتون بانو کا بھی ہے۔ جس کی دوربین آنکھ نے معاشرے میں پھیلی جبر و مدافعت کی کشمکش، انسان اور قدرت کی کشمکش، محرومی اور مراعات کی دورخی پالیسی اور طبقاتی رسہ کشی کے مناظر کو دیکھا، محسوس کیا اور ان حقائق کو کہانی کے روپ میں ڈھال کر ہم تک پہنچایا۔ انسانی فطرت بھی عجیب چیز ہے، حقیقت سے آنکھ چراتی ہے مگر جب

حقیقت کو الہامی بنا دیا جائے تو دلچسپی سے سنتی ہے تو زیتون بانو کے افسانوں میں کسی فرسودہ جکڑ بندیاں، قدامت پسند اور قدامت پرست تہذیب کی پابندیاں، خاندانی رسومات کی بیجا رکاوٹیں، غلامی اور آزادی کی صلیب پر لٹکتے بے بس انسانوں کی کاوشیں پڑھنے والوں کو جھنجھوڑتی ہیں۔ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں "کب انسان انسان کی قید سے آزاد ہوگا۔ کب کہنہ روایات کی زنجیریں کٹیں گی۔ اور کب انسان کو اس کا حق ملے گا۔" زیتون بانو کے فن کی باریکیوں کو جانچنا پرکھنا اور کھنگالنا تو سکہ بند نقادوں کا کام ہے۔ میں تو صرف یہ جان سکی ہوں کہ بانو کی شخصیت زیتون کے پھولوں کی طرح خوش رنگ اور اتار چڑھاؤ والی ہے۔ زیتون کے پھول جو کھلتے تو سفید ہیں۔ مگر آدھی عمر کو پہنچ کر گہرے نیلے رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ زیتون بانو ایسی ہی پربہار شخصیت کا نام ہے اور اس کا فن اسکی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ نرم و نازک اور کومل اور ہمہ دم دساکسی بھی فن کار کے فن کو اس کی شخصیت سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور اگر یہ جدا ہو جائیں تو فن کار کے فن میں جاذبیت باقی رہتی ہے اور نہ شخصیت میں کشش۔ زیتون بانو ایسی ہی مربوط قسم کی فن کار ہیں۔ وہ جو دیکھتی ہیں دوسروں کو بھی دکھاتی ہیں جو محسوس کرتی ہیں بلا جھجک کہہ دیتی ہیں۔ وہ عورت کی عظمت کی قائل ضرور ہیں مگر اس کی عظمت کا بھرم رکھنے کے لئے جھوٹ نہیں بولتیں۔ اس کی خامیوں پر پردہ نہیں گراتیں۔ ان کا افسانہ "چلچی" بہ ثبوت کے طور پر پیش کرتی ہوں۔

مجموعہ کا یہ آخری افسانہ میں نے سب سے پہلے پڑھا اور سوچا "زیتون بانو کیا پشتو زبان کی عصمت چغتائی بننے چلی ہیں؟" مگر پورا افسانہ پڑھنے کے بعد مجھے اپنا تاثر غلط لگا۔ یہ پچھلی تو با اختیار طبقے کے جبر و استبداد کی داستانِ الم ہے۔ عورت کی بے چارگی، سادگی اور معصومیت کی خون آشام کہانی ہے جس کو بیان کر کے زیتون بانو نے جرأت سے صنفِ قوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی مکاری اور سفاکی کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس کو اسکے باطن میں جھانکنے کی دعوت دی ہے۔

★★

گونگا بہرا ایڈیٹر

مشتاق قمر



قند میں مجھے ہمیشہ ایک خاص نوع کی ادبی مٹھاس محسوس ہوتی ہے میں اس بات کا دعویٰ ہرگز نہیں کرتا کہ ملک کے دیگر ادبی رسالے ہر قسم کی مٹھاس سے عاری ہیں کیونکہ ایسا ہر دعویٰ غیر فطری اور ناقابلِ قبول ہوگا۔ لیکن ایک بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قند کی مٹھاس کی اپنی پہچان اور اپنا ذائقہ ہے بالکل ایسے ہی دیگر رسائل کی مٹھاس اور کڑواہٹ کی اپنی پہچان اور اپنا ذائقہ ہے قند منفرد تو ہے مگر میں اس پر "سب سے بہترین" کا لیبل چسپاں نہیں کرنا چاہتا البتہ قند کا اپنا رویہ اور دائرہ کار ہے جس میں اس کی حیثیت نمایاں اور منفرد دکھائی دیتی ہے قند کی جس خوبی نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ اس کی ادبی پالیسی ہے قند نے ہمیشہ قومی سطح پر متوازن سوچ پر مبنی تخلیقات کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ علاقائی عصبیت اور "بندہ پروری" کبھی بھی اس کا شیوہ نہیں رہا اس سے ہرگز یہ مراد بھی نہیں کہ تاج سعید کا کوئی دوست نہیں یا قند نے علاقائی ادب کی جانب سے آنکھیں موند رکھی ہیں علاقائی ادب کے بغیر قومی سطح پر کسی ادبی مینار کی تعمیر ممکن نہیں قومی تخلیقی سوچ علاقائی سوچوں کے ندی نالوں سے ہی سمندر بنتی ہے۔ اور استحکام حاصل کرتی ہے سمندر چشموں پر سے پھوٹا نہیں کرتے ندیوں اور دریاؤں

سے توانائی حاصل کرتے ہیں لیکن بعض لوگ انتہائی نادانی میں علاقائی اور قومی سطح کو ایک دوسرے کی ضد اور مخالف قوتیں سمجھ بیٹھے ہیں پاکستان کے جغرافیے پر نگاہ ڈالیں تو یہ خوش آئند صورت خود بخود ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ پاکستانی قومیت جس مجرد کیفیت کا نام ہے اسکی تعمیر پاکستان کے سارے صوبوں اور علاقوں کی معروضی سوچ سے ہوتی ہے کسی ایک علاقے یا صوبے کو (آئینی لحاظ سے بھی) کسی دوسرے علاقے یا صوبے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہر صوبے کی تخلیقی سرگرمیوں کو اپنے علاقے کی مخصوص ثقافتی فضا میں کھل کر سانس لینے کی پوری پوری آزادی ہے اور فی الواقعہ یہ ایک فطری اور کائناتی عمل بھی ہے لیکن بدقسمتی سے ادب میں کچھ ایسے لوگ چوری چھپے داخل ہو گئے ہیں جو مسئلے کو مجموعی طور پر سمجھنے سے قاصر ہیں وہ نادان دوست کا رول ادا کرتے ہوئے نہ صرف قومی تخلیقی ادب بلکہ خود علاقائی ادب کی ترقی و ترویج کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوتے ہیں یہ معمولی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آرہی کہ جزو کی کل کے بغیر کوئی حیثیت نہیں بنتی بلکہ ایسے ہی جیسے جزو کے بغیر کُل کی تخلیق ممکن نہیں یہاں میں اس امر کی بھی وضاحت کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ قومی ادب سے میری مراد کسی خاص زبان میں تخلیق ہونے والے ادب سے نہیں زبان اور ادب دو مختلف چیزیں ہیں زبان ایک ذریعۂ اظہار ہے جب کہ ادب پوری قوم کی سوچ کا عکس ہوتا ہے قومی سوچ کو کسی بھی۔ علاقائی یا قومی، زبان میں منعکس کیا جاسکتا ہے ادب کی طرح زبان کا مسئلہ بھی سیدھا سادہ ہے کسی خاص علاقے میں بولی یا سمجھی جانے والی زبان علاقائی کہلائی جاسکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جبکہ مجموعی اعتبار سے بولی اور سمجھی جانے زبان کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہوتا ہے یہ سارا عمل غیر شعوری ہے اگر زبان اُردُو

ادب کے معاملے میں شعوری کوششوں اور کاوشوں کو کوئی دخل حاصل ہوتا تو آج برِ صغیر میں صرف ایک ہی زبان (یعنی انگریزی) سمجھی اور بولی جاتی۔ باقی ساری زبانیں جن کا اس علاقے سے تعلق ہے کب کی مٹ چکی ہوتیں مختلف قوموں کے مختلف سطحوں پر رابطے سے زبانیں ایک دوسری کا اثر قبول کرتی ہیں یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ اور کائناتی فعل ہے کسی ایک ملک یا علاقے سے مخصوص نہیں لیکن بدقسمتی سے بعض "دانشور" آج کے صنعتی معاشرے میں بھی، جہاں اظہار کو اظہار کے وسیلوں پر نمایاں فوقیت حاصل ہے ان فروعی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں آج کے دور کی سب سے بڑی حقیقت مشین ہے اور مشین کی زبان "ہاتھ کا لمس" ہے "کھل جا سم سم" کے خالی الفاظ کی زبان سے صنعتی دور کی مشین بالکل ناآشنا ہے در اصل زبان کو مسئلہ بنانے والے لوگ بنیادی طور پر نفسیاتی کیس ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی FRUSTATION کا شکار ہوتے ہیں اور جب انسان FRUSTATION کا شکار ہو تو اس کی نگاہ قدرتی طور پر محدود ہو کر رہ جاتی ہے لیکن ہم ایسے دوستوں سے مایوس نہیں کیونکہ مایوسی اور افسردگی مستقل نہیں ہوتیں ان کا اثر زائل ہوتے ہی نگاہ کے وسٹاز VISTAS خود بخود کھل جائیں گے مناظر وسعت اور کشادگی کا اظہار کرنے لگیں گے اور سوچیں درست سمت اختیار کر لیں گی خصوصاً قند جیسے رسائل کی موجودگی میں ان مایوس اور افسردہ اشخاص کو درست سوچ اپنانے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

قند کا وہ پہلا میل پتھر جس پر خوشحال خان خٹک کی تصویر آویزاں تھی اور یہ تازہ ورق جس پر مجید امجد کی تصویر چھپا ہے ایک طویل مگر خاموش اور بامعنی سفر کی داستان ہے خاموش اس لئے کہ قند کا کوئی ایڈیٹر نہیں بس ایک شخص

ہے جس کا نام تاج سعید ہے اور جو پاکستان کے سارے علاقوں کی تخلیقات کو وقتاً فوقتاً چھپوا کر بازار میں لے آتا ہے یہ شخص گونگا اور بہرا ہے قند کا ایڈیٹر بننے سے پہلے بھی یہ شخص تاج سعید تھا اور اس کے بعد بھی نہ اس میں آنکھ کا اضافہ ہوا ہے نہ زبان اور نہ کان کا حالانکہ اس دوران میں اور اس سے پہلے اور بعد بھی بہت کچھ ہوا کچھ ایڈیٹر شیکسپیئر بن گئے کچھ فردوسی، نظیری، اور بعض رسل اور سارترے تاج سعید... تاج سعید ہی رہا لیکن اس گونگے اور بہرے پن کے باوجود آپ کو قند کے ہر صفحے پر تاج سعید کی موجودگی کا بھرپور احساس ہوگا آپ اس کی اعانت کے بغیر قند کا ایک ورق بھی پلٹ نہیں سکتے بلکہ قند کے ہر ورق کی کنڈلی خود تاج سعید ہی کھولتا ہے لیکن جوں ہی آپ اندر داخل ہوتے ہیں تاج سعید ایک شریف میزبان کی طرح آپ کو اپنی سوچ کی خوشبو میں رچا بسا چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہے وہ غائب نہ ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا وہ ہرگز یہ نہیں کہے گا دیکھو وہ شمارہ ایک بہت بڑے محب وطن اور اعلیٰ پائے کے گیت نگار کی کاوشوں کا مرہون منت ہے جس کے بغیر حب الوطنی کی شمع جلانا ممکن نہیں وغیرہ وغیرہ حقیقت میں تاج سعید کو خود بھی اس بات کا پوری طرح احساس نہیں کہ وہ انتہائی خاموشی سے کتنی بڑی قومی خدمت انجام دے رہا ہے وہ تو ایک مجذوب کی طرح ہر دوسرے تیسرے ماہ ایک ہلکی سی تخلیقی پھونک مار دیتا ہے لیکن وہ ہرگز یہ نہیں جانتا کہ اس کی پھونک سے ذہنوں اور دلوں کی کدورت دھل جاتی ہے وہ خود دھونی رما کے ایک ہی جگہ بیٹھا رہتا ہے اور کبھی اٹھتا بھی ہے تو انتہائی خاموشی سے اپنے خرچ پر ادھر ادھر کا چکر لگا کر واپس اپنے مقام پر پہنچ جاتا ہے نہ تو اس نے اپنے ساتھ شام منانے کا ڈھونگ رچایا ہے اور نہ ہی اپنے آپ کو بہت بڑا گیت نگار تسلیم

کروانے کے لئے ہتھکنڈوں کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے حتیٰ کہ اس نے کسی رسالے کو تاج سعید نمبر نکالنے کی ترغیب و تحریص بھی نہیں دلائی کبھی کبھی تو لگتا ہے جیسے قند پر ایڈیٹر کے طور پر اپنا نام بھی محض روایتاً لکھوا دیتا ہے کہ وہ ایک رسم جہاں ہے لیکن اس اشتہاری "منعولیت" کے باوجود تاج سعید نے قند کو ایک خاص قومی پہچان دی ہے اس نے انتہائی خاموشی میں وہ سب کچھ کیا ہے جو بہت سے لوگ بلند و بانگ دعوؤں اور فلک شگاف نعروں کے باوجود نہیں کرتے بلکہ نعروں کے برعکس کرتے ہیں اور جب کبھی جرم کا احساس خوف کا بھوت بن کر ناچنے لگتا ہے تو "قومی ادب" کا شمارہ خاص بھی نکال دیتے ہیں تاج سعید نے کبھی کوئی نعرہ نہیں لگایا دراصل اس کا کام اتنا کٹھن اور حوصلہ شکن ہے کہ اسے نعرے لگانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

مجید امجد نمبر ایک بہت بڑے شاعر کو بروقت خراج عقیدت پیش کرنے کی مستحسن کوشش ہی نہیں ایک بہت بڑے جذبۂ حب الوطنی کا اظہار اور علاقائی عصبیت سے بلند تر سوچ کی شاندار مثال بھی ہے مجھے اس کے مندرجات کے بارے میں کچھ نہیں کہنا اگرچہ اس کی انفرادیت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا اس سے مجید امجد اور اس کی شاعری کے کم و بیش سارے گوشے سامنے آجاتے ہیں ۱۸۴ صفحے کا یہ مختصر سا نمبر ایک عظیم شاعر کی پہچان کا قابل اعتماد ذریعہ بن گیا ہے اور اس کے لئے میں تاج سعید کو اس لئے مبارک باد نہیں دے رہا کہ وہ ایسے الفاظ سننے کا عادی نہیں اور میں اسے اس چھوٹے پن کا عادی بنا کر غلط راستے پر ڈالنا نہیں چاہتا میں اس قسم کی ترغیبات کو بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا کہ اس سے بسا اوقات شخصیت پرستی کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے حلقہ ارباب

ذوقِ تخلیقی افراد کا ایسا ادارہ ہے جس میں شخصیت کے بجائے شخصیت کے اظہار کا پلہ بھاری رہنا چاہیے اور جہاں کہیں شخصیت کے بجائے شخصیت کے اظہار کا کوئی واقعہ سامنے آئے ایسی تقریبات کا انعقاد لازمی بن جاتا ہے کہ ان کی بدولت تاج سعید جیسے گونگے بہرے ایڈیٹروں کے اظہار کو زبان دے کر ان کی قومی خدمات کی صحیح قدر و قیمت متعین کی جا سکتی ہے۔

★ ★



فارغ بخاری

ایک فکری جائزہ

اعجاز راہی

کسی بھی نوآبادیاتی نظام کے خاتمے اور معاشرے کے بدن سے اس کے منفی اثرات کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے کے لئے وحدتِ فکر کے ساتھ جدوجہد کا عمل آغاز پاکر ایک طرف تو استعمار کو فنا کی گھاٹیوں میں دھکیلنے کے لئے آگے بڑھتا ہے ۔ تو دوسری طرف استعماریت کے اثرات و نشانات نو آبادیاتی افراد میں تلاش کر کے ختم کرتا ہے ۔ لیکن جہاں آزادی کی جدوجہد کا عمل پورے منطقی نتیجے پر پہنچے بغیر محض جذباتی برانگیختگی کے اثرات میں خلط ملط ہو کر انبوہ پر اثر انداز ہوتا ہے تو اس ——— IMMETURE PROCESS میں آزادی تو حاصل ہو سکتی ہے ، لیکن آزادی اپنے وسیع تر ——— CONCEPTION میں لوگوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہونے اور قلوب میں اترنے کی صلاحیت کھو دیتی ہے ۔ اور ایسی صورت میں بقول فرانز فینن " جہاں آزادی کی جدوجہد لوگوں کو پوری طرح نہیں جھنجھوڑ پاتی وہاں کے دانشور ہر فن مولا ، تیز ،

عیار نظر آتے ہیں۔ ہمیں یہاں تصور کی وہی صورتیں نظر آتی ہیں جو وہ استعمار اور اس کے گماشتوں سے ربط و ضبط کے دوران حاصل کرتے ہیں۔" ایسے دانشوروں کے لئے موقعہ پرستی ان کی پیشانی پر پہچان کا سائن بورڈ بن کر آویزاں ہو جاتی ہے۔ عصری شعوری اور زندہ تحریکوں سے ان کا رشتہ قائم نہیں رہتا۔ وہ یا تو سرکار کے گیت تخلیق کرتے ہیں۔ یا انفرادیت پسندی کا خول پہن کر الگ ہو بیٹھتے ہیں۔ اس کے برعکس ادیبوں کا ایک دوسرا طبقہ بھی ادب تخلیق کرتا دکھائی دیتا ہے جو استعمار کے خاتمے یعنی آزادی سے قبل نو آبادیاتی معاشرہ میں موجود سامراجیت اور اس کے تضادات کے حوالے سے نہ صرف ادب تخلیق کرتا ہے، بلکہ آزادی کی تحریکوں میں عملی طور پر شریک ہو کر ادب کے محاذ پر مورچے سنبھال لیتا ہے۔ اور نو آبادیاتی معاشرہ کے مسائل کا اظہار مصلحت کا کوئی رویّہ ظاہر کئے بغیر کرتا رہتا ہے۔ آزادی کے بعد بھی معاشرہ میں موجود استعماری اثرات اور طبقاتی جبریت کے خلاف جدوجہد جاری رکھتا ہے۔

تقسیم ہند اور اس کے بعد یہی صورت حال پاکستانی ادب میں دکھائی دیتی ہے۔ آزادی سے قبل انگریز سامراج نے اپنا تسلّط یہاں کے دیوالیہ نوابوں کے توسط سے قائم رکھا تھا۔ تحریک آزادی کی دوسری صف میں بھی تقریباً یہی نوابین قیادت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور آزادی کے بعد بھی

یہی نواب مسندِ اقتدار پر قابض رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں لوگ پہلے بھی محکوم تھے۔ آزادی کے بعد بھی یہی محکومی عدمِ معاشی انصاف اور طبقاتی سیاست کی صورت موجود رہی، چنانچہ پاکستانی ادب میں بھی یہ دونوں رویے جن کی طرف میں نے پہلے اشارہ کیا ہے، ایک ساتھ رواں نظر آئیں گے۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک (کہ یہ تحریک انقلابی ہونے کی داعی تھی) سے وابستہ اور غیر وابستہ سینکڑوں ادیبوں کے ناموں کو عصری شعور اور معاشرہ میں جاری جبری قوتوں کے خلاف تلاش کیا جائے تو حقائق اور تجزیے کی بنیادوں پر چند ناموں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بلکہ بھک منگوں، اور حاشیہ برداروں موقع پرستوں اور مفاہمت اندیشوں کے نام قافلہ در قافلہ سامنے آتے چلے جائیں گے۔ صرف چند نام ہی ایسے نظر آتے ہیں جن کا شعور عصر کے خمیر سے ترتیب پاتا ہے۔ اور ان کا فن ہیئت اور مواد کے اعتبار سے معاشرہ میں جاری استحصالیت کے خلاف وقت کے ساتھ سفر کرتا ہے۔

سید فارغ بخاری کا نام بھی ان ہی فن کاروں میں شامل ہے جن کے سامنے ایک عظیم نصب العین بنی نوع انسان کی کلی آزادی کے منشور کی صورت موجود رہا ہے۔ وہ اس بات کا ادراک رکھتے ہیں کہ انسانیت کی اساسی قدر شکستہ، غیر ہموار اور مفروضوں پر قائم معاشرہ سے مربوط نہیں۔ بلکہ

تمام لوگوں کے لئے ایک سے مواقع فراہم کرنے، ایک سے انداز میں سوچنے اور ایک ساتھ قدم اٹھانے میں معاشرہ کا صحیح تصور پنہاں ہے۔ اسی لئے وہ اپنے ذہنی سفر میں اپنی تخلیقات کو اپنے دور کی سچائیوں سے دور نہیں ہونے دیتے فارغ بخاری اپنے دور کے ایک ایسے حساس فن کار ہیں، جنہوں نے پسے ہوئے طبقوں پر ڈھائے جانے والے کرب کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ اپنے جسم پر اس کو محسوس کیا۔ پھر اس کرب کو ادب کا حصہ بنایا ہے

جو ڈر تے ہیں ڈوب بھی جائیں تو غم نہیں۔ ان گہرے پانیوں کے شناور بھی آئیں گے
ہے رت یہی تو جسم کی دیوار توڑ کر۔ اندر جو زلزلے ہیں وہ باہر بھی آئیں گے

اردو ادب میں دور دور تک ایک عجیب بے حسی کے مظاہرے دکھائی دیتے ہیں۔ ظلم کی نشان دہی کرنے والے ظالموں کے ساتھ اس طرح جڑے بیٹھے ہیں کہ دیکھنے والوں کا ایمان لفظوں پر سے اٹھنے لگتا ہے اور لفظوں کے سوداگر لفظ کی بے توقیری کے نوحے لکھنے لگتے ہیں۔ تب یہ سوال ابھر کر سامنے آجاتا ہے، کہ لفظ طبقاتی معاشرہ میں کوئی مثبت کردار ادا کر بھی سکتا ہے؟ ۔ کرب دیکھتے ہیں، معاشی اور سیاسی سطح پر بڑھتی گھٹن میں لفظ کوئی ردِ عمل کوئی تحریک پیدا نہیں کر سکتا۔ فارغ بخاری اس صورت حال میں ایک ایسے شاعر کی حیثیت میں ظاہر ہوئے ہیں، جو لفظوں

کو مردہ خانے میں سڑتی لاش قرار دینے کی بجائے، صدا قتوں کا عکاس اور آئینہ دار سمجھتے ہیں۔ وہ ایک واضح رویے کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں ؎

لفظوں سے جھانکتی ہیں برہنہ حقیقتیں۔ فن میں کچھ اپنے دور کی پرچھائیاں تو ہوں

اور فارغ بخاری کے ایک ایک لفظ سے اپنے دور کی برہنہ حقیقتیں جھانکتی ہیں لیکن ان کی نظر میں سماجی مسائل، طبقاتی کشمکش کا شعور اور جبری قوتوں کے خلاف ردِ عمل محض عکاسی کی حد تک نہیں رہتا، بلکہ وہ اس صورتحال کو اپنی ذات کا حصہ بناتے ہیں۔ کہ وہ خود طبقاتی نظام کے اس حصہ سے تعلق رکھتے ہیں، جو نشانہ بنتا ہے۔ چنانچہ معاشرے کے دوسرے اہم عناصر محنت کش طبقوں سے اپنا ذہنی رشتہ برقرار رکھتے ہوئے سماجی غائت سے مماثل ادب تخلیق کرتے ہیں تو ان کی شاعری عام ترقی پسند شاعری کے برعکس فلسفیانہ پختگی، تاریخی شعور، جمالیاتی و فنی رچاؤ کے ساتھ غیر مبہم انداز میں راستوں کا تعین بھی کرتی ہے۔ ؎

عزمِ سفر کیا ہے تو اب فاصلے نہ دیکھ
ہر منزلِ حیات کو بیگانہ دیکھ
فارغ نئے افق ہیں نئی جلوہ پاشیاں
ڈوبے ہوئے ستاروں کا اب راستہ نہ دیکھ
کتنی قبائیں پاؤ گے فارغ لہو میں تر

تاریخ کو اگر لبِ اظہار مل گیا
آؤ کہ اپنے خون کا پرچم اچھال لیں
گلشن میں اور کچھ نہ بھی ہو رنگ و بو تو ہو

ترقی پسند ادیبوں پر یہ الزام آتا ہے۔ کہ وہ فن کے تخلیقی سفر میں جمالیاتی پہلو کو دانستہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور انسانی زندگی کے بارے میں مخصوص کلیوں اور قاعدوں کو شاعری کا رویّہ بناتے ہیں۔ فارغ بخاری کی شاعری اس مفروضے کو رد کرتی ہے۔ کہ ان کے ہاں انسان کا تصور ایک حتمی حقیقت کے طور پر آیا ہے۔ وہ انسان کو ثانوی حیثیت دینے اور اسے روایتی سماج کے نام نہاد اخلاقی اصولوں کے تابع کرنے کی بجائے اس کی کلی خواہشات کا احترام کرتے ہیں۔ ان کا فن انسان دوستی کا مکمل اظہار ہے۔

آج کے دور کا دعویٰ ہے کہ عنقا کے سوا
کوئی عقدہ نہیں عرفانِ بشر سے آگے

فارغ بخاری کی شاعری کے توسط سے جس تخلیقی ویلے کا تشخص اُبھرتا ہے۔ وہ بے حد سخت فکری آشوب سے پوری طرح آزاد، شاعرانہ قوتِ متخیّلہ سے بھرپور ذہن رسا، ماہیتِ قلب سے وطن پرست تہذیب و ثقافت کے کھنڈروں میں قومی تشخص کا کھوجی، اور طبقاتی منظر نامے میں محصور اد کار کی نئی جہت و تشکیل میں ہمہ وقت مصروف دکھائی

دیتا ہے۔ ایسی شکل کا اظہار ہوتا ہے، جو لمحوں کی تشکیک، شکست و ریخت، فرسٹیریشن اور جمود کی اقدار کو رد کر کے آگے بہت آگے، سو حرکت اور غیر متزلزل ارادوں کے تاریخی بہاؤ میں اپنی شناخت کراتے ہیں۔ وہ کھنڈر، بے قوت نیم مردہ جینے کی آرزوں پر زنگ و لو کی آمیزش سے مقصدی، قابل فہم اور آسودہ زندگی کے امکانات کا نقشہ بناتے ہیں۔ وہ اپنے کشف اپنے تجزیئے کو لفظوں کی شگی کھونٹی پر لٹکا کر اپنے فطری ایمان کو رسوا نہیں کرتے۔ بلکہ شعری حسن، استعاراتی کونپلوں تشبیہاتی گل بوٹوں اور علامتی رنگوں سے اپنے تجربے کے نقش و نگار بناتے ہیں، ان کا طرز احساس عصر سے وفاداری اور فرسودہ بدہیت روایتی رویئے سے بغاوت کرتا ہے۔

جسموں کی قید توڑ کے نکلے تو شہر میں
ہونے لگا ہے ہم پہ گماں دیوتاؤں کا

سب چل رہے ہیں صدیوں سے پرکار کی طرح
محدود دائرے سے نہ باہر گیا کوئی ——

آؤ کہ کار و بارِ جنوں ابتدا کریں
گلشن میں کچھ بہار کی انگڑائیاں تو ہوں

دیکھ یوں وقت کی دہلیز سے ٹکرا کے نہ گر
راستے بند نہیں سوچنے والوں کے لئے

آؤ تعمیر کریں اپنی وفا کا معبد
ہم نہ مسجد کیلئے ہیں نہ شوالوں کے لئے

ایک ایک مصرعہ محض تجربے کا اظہار یا فکری اعتبار سے اپنے عہد کے شعور ہی پر محیط نہیں بلکہ لفظوں کے چناؤ، ان کے استعمال میں جدید تر تکنیک، یہ شعری معرکہ انہیں ہم عصروں میں ممتاز اور نئے قافلہ سالاروں تک پہنچاتا ہے۔ ان کے ہم عصروں کی نسبت وہ اپنے لہجے میں OREGIONAL . اور لفظوں کے استعمال میں متعارف طریق کار سے ماورا ہیں۔ فارغ بخاری ثقافت کے میدان میں بھی اپنا نام رکھتے ہیں۔ ان کی منطقی اثباتیت کے جوہر نے انہیں ثقافتی اقدار کی تلاش کے قریب کر دیا ہے۔ وہ اپنے ادب جنسی لذتیت، طلسماتی ماحول، خوف میں مبتلا کر دینے والے فکری منطقوں کو قبول کرنے کی بجائے انہوں نے لوک ادب کا راستہ اختیار کیا ہے۔ تاکہ گزرے لوگوں کے احساسات و تجربات کو اپنے تجربوں کے سفر میں زادِ راہ بنا سکیں۔ اور حال اور ماضی کے درمیان نقطے مٹنے نہ پائیں اور اس سفر میں کئی تصانیف کے سنگ میل گاڑ چکے ہیں۔ اور ان کا ذہنی سفر ہنوز جاری ہے۔



تاج سعید

ایک بار میں نے "قند" کے صفحات پر اس کے بارے
چند جملے لکھے تھے۔ اس وقت میرا خیال یہی تھا کہ وہ میرے اس
بیان کا بُرا منائے گا۔ لیکن یار لوگوں کے بہکانے کے
باوجود جب اس نے اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا تو مجھے بے حد
خوشی ہوئی۔ اس لئے نہیں کہ ہم نے ایک مدت سے ایک جگہ،
ایک مقام، ایک سوچ، اور ایک فکر پر اکٹھا مل جُل کر کام کیا ہے
اس کے شب و روز کا علم مجھے تھا اور میرے شب و روز کا
اُسے۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ لوگوں کی چال اپنا کام کر گئی
اور وہ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مجھ سے
بچھڑ کر اس پر کیا بیتی، لیکن مجھے اپنا حال معلوم ہے اس لئے
کہ میں اس کی اچھائیوں کا ہمیشہ معترف رہا اور قطع کلامی کے بعد بھی
میرے دل میں اس کے خلاف کسی قسم کا زہر نہیں تھا۔ اور اس
بات کا علم مجھے اس وقت ہوا جب ہم دونوں برسوں کی جدائی
کے بعد دوبارہ ملے، اور اسے میں نے پہلے ہی کی طرح اکھڑ، پہلے

ہی کی طرح معصوم اور پہلے ہی کی طرح پرجوش اور بے باک پایا۔

شاعر ہونے کی وجہ سے حشمی کو پاک و ہند میں سبھی جانتے ہیں لیکن انسان ہونے کے ناطے بہت کم لوگ اس سے آشنا ہیں۔ اردو کے کچھ ادیبوں سے اس نے ایک بار خط وکتابت شروع کی تو وہ سب ہی، جن کو اس کے خطوط ملے، اسکے دالہ و شیدا ہو گئے لیکن جب ادھر سے خطوط کی رفتار میں تیزی اور وارفتگی آئی تو اس کی ازلی و ابدی تنہائی نے اسے آلیا اور اس نے سب دوستوں سے قطع تعلق کر لیا۔ اسکے بعد ان کے خطوط جب کبھی میرے نام آتے تو وہ اس بے رخی اور بے توجہی کی شکایت کرتے اور میں جب اس سے اس کچھ ادائی کا ذکر کرتا وہ ہنس کے ٹال جاتا۔ اس کی بے رخی کے تذکرے سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے یا یہ سب کچھ اس کے مزاج کا خاصا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ زمانے کی گردش اور اپنوں کی سرد مہری نے اسے دنیا سے برگشتہ کر دیا ہے۔ وہ پھول پتوں، درختوں، پرندوں اور حشرات الارض پر اعتماد کرتا ہے۔ لیکن آدمی پر اسے اعتماد نہیں رہا۔ اس کے اعتماد اٹھ جانے کی انتہا یہ ہے کہ اسے اپنے آپ پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے میں اس کے بھائیوں، بہنوں کا زیادہ ہاتھ ہے، اس لئے کہ اس نے جبکی جانب ہاتھ پھیلایا اسی نے

ہاتھ توڑنے کی کوشش کی۔ لہٰذا وہ اعتماد کرے تو کس پر ۔؟ آپ پوچھیں گے اس کی پُر خار زندگی میں کبھی بہار بھی آئی تھی یا وہ ہمیشہ سے خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہوا کے رحم و کرم پر ڈولتا رہا ہے ۔ جی ہاں ۔ بہار کی کلی نے اس کے آنگن میں بھی آنکھ کھولی تھی ۔ اس وقت بھی گھر کے بھیدی اس کی لنکا ڈھانے کے درپے تھے اور اس نے اُس وقت کہا تھا ؎

بخت زریں میرے ماں باپ کا یہ کہنا ہے ۔
نیک اطوار تو گھر میں اگر رہتا ہے ۔

بخت زریں کے لئے اس نے دنیا بھر کی رسوائی مول لی ۔ اس محبت کا تحفہ اسے عقیل کی صورت میں ملا ، تو بخت زریں روٹھ گئی اور اس نے اپنے آپ کو ایک بے سہارا تنکے کی طرح سمندر کے تھپیڑوں کے حوالے کر دیا ۔ مدت تک وہ عقیل کی اُنگلی تھامے جگہ جگہ پھرتا رہا ۔ عقیل کی رفاقت نے اس کے ان زخموں کو مندمل کر دیا ، جو اس کے بھائیوں ، اور بہنوں نے اس کے جہکر پر لگائے تھے ۔ اب وہ اپنی دنیا میں مگن تھا ۔ عقیل اس کا بھائی بھی تھا ، بیٹا بھی تھا ، دوست بھی تھا ۔ اور یارِ غار بھی تھا ۔ اس نے اپنے دل کی ہر بات اس کو بتا دی تھی ، اس پر اسے بڑا اعتماد تھا اور اسی اعتماد کے بھروسے اس نے اپنی بے پناہ محبت عقیل پر نچھاور کر دی ، لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ عقیل بھی ایک روز چپکے

سے ایک موڑ پر اسے تنہا چھوڑ کر چلا گیا اور وہ پھر اس بھری پُری دنیا میں بے یار و مددگار رہ گیا۔

اس کی جواں مرگی نے اس کی پیاس میں اضافہ کر دیا اور وہ ایک پیاسے سمندر کی طرح رہ گیا جس کے سینے میں پانی کی لہریں ٹھاٹھیں مارتی رہتی ہیں لیکن وہ اسے خود نہیں پی سکتا، اس لئے کہ پانی کی تلخی اور کڑواہٹ اس کی زندگی میں اضافہ کرنے کی بجائے اس کو موت کی طرف لے جاتی ہے۔ لیکن وہ سخت جان نکلا، دنیا کے میلے میں اس نے جب اپنے جیسے دوسروں کو زخموں سے چور دیکھا تو اس کے زخم بھی بھرنے لگے۔ لیکن تنہائی کے لمحوں میں اب بھی جب اسے عقیل کی یاد آتی ہے تو وہ خون کے آنسو روتا ہے۔

اسکی زندگی کے اس صحرا کا اداس اور پژمردہ پھول خزاں کی زد میں رہا، خزاں جو ازل سے اس کے تعاقب میں ہے اور ابد تک اس کا مقدر رہے گی۔ اسکی زندگی کے یہ رنگ اس کی شاعری میں جلوہ گر ہیں اور اس میں بھی خزاں کے سبھی رُخ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ ایک مُدت سے اپنی صلیب اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کی سوچ و فکر پر گرم دوپہر دل کا راج ہے، سورج کی حکمرانی ہے اور خزاں کی یورش ہے۔ اس گرمی میں اس کا چہرہ تپ کر کندن بن گیا ہے۔

اس کی ہر شکن میں گرم دوپہروں کی کرنیں جذب ہو چکی ہیں اور وہ

اسی میں خوش ہے، اسی میں مگن ہے، اس لئے کہ آدھی پر سے اس کا اعتماد اٹھ چکا ہے۔ ع

ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں،

لیکن ٹھہریئے ابھی مجھے اس کے ایک اور رخ کو بھی پیش کرنا ہے اور وہ ہے اس کی ننھی منی بے پالک سدرہ جسے اس نے اپنی عمر کی آخری حد میں اپنا سہارا بنایا ہے۔ وہ اس کی معصوم شرارتوں کو دیکھ دیکھ کر جی اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وہ اس کے آنگن میں کلکاریاں مارتی ہے تو وہ تھوڑی دیر کیلئے اپنے کندھوں سے اپنی صلیب اتار لیتا ہے۔ اور مستقبل کے سہانے خوابوں میں ڈوب جاتا ہے اور اسکی ان پر امید نظروں میں زندگی کی وہی وارفتگی لوٹ آتی ہے جو کسی وقت عقیل کو دیکھ کر اس کے جسم میں خون کی گردش تیز کر دیتی تھی اور اس تیزی اور تندی کے آگے وہ خزاں کی ہر شام کو بہار بداماں کر لیتا ہے۔

اور اس کے تاریک گھروندے میں امیدوں، آرزوؤں، اور انسانیت کی کومل کرنیں اتر کر اس کے خیالات کی دنیا میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہیں۔ اور وہ اس لہر میں نظمیں، غزلیں، گیت اور دوہے لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔

★ ★



کالے موسموں کا مُسافر

فقیر حسین ساحر

انسان اپنی ارتقا کی منازل طے کرتے ہوئے آج جس مقام پر پہنچ چکا ہے وہاں اُس کے چار سُو آوازوں اور انسانوں کا بے پناہ ہجوم تو موجود ہے لیکن آوازوں اور انسانوں کے اس جنگل میں ایک حساس انسان آج بڑی شدّت سے محسوس کر رہا ہے کہ ہر شخص اپنی ہی کہے جا رہا ہے دوسرے کی کوئی نہیں سنتا، ہر شخص اپنے ہی بارے میں سوچ رہا ہے۔ اپنے گرد و پیش میں موجود انسانوں کے وجود کا اُسے کوئی احساس نہیں، ہر شخص اپنے وجود کی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اس جنگ میں وہ اپنے آپ سے بھی کشمکش میں مبتلا ہے اور انسانی رشتوں سے بھی نبرد آزما ہے، اس لئے کہ آج کے انسان کی رگ و پے میں یہ احساس بڑی شدّت سے سرایت کر چکا ہے کہ اگر وہ ایک پل کے لئے بھی غافل ہُوا تو اس کے گرد و پیش میں موجود استحصالی طاقتیں اُس کے وجود کو نیست و نابود کر دیں گی۔

اعجاز راہی نے عصر حاضر کے انسان کی زندگی کو نہ صرف یہ کہ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کا مختلف

پہلوؤں سے مشاہدہ کیا ہے اور بڑی شدّت سے محسوس کیا ہے بلکہ ان حقائق کا اپنی زندگی کی مختلف منازل پر خود بھی سامنا کیا ہے۔ انہوں نے بھی وقت کے سازشی گروہ کے ہاتھوں اپنا اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کا استحصال ہوتے اور دلوں کو ٹوٹتے دیکھا ہے ؎

وقت بھی سازشی گروہ کی طرح چھپ کے بیٹھا تھا لوٹنے کے لئے
میرا دِل بھی انہیں میں شامل تھا جو کھلونے تھے ٹوٹنے کے لئے

لیکن لٹنے اور دِل کے ٹوٹنے کے باوجود بھی اعجاز راہی اور اُن کے طبقے اور گروہ کا انسان اپنی بقا کی جنگ جاری رکھتا ہے۔ ہمت ہارتا نہیں، ہتھیار ڈالتا نہیں بلکہ ہر حال میں وقت کا سامنا کرتا ہوا اور زندگی کے اندھیرے راستے پر اپنی منزل کی تلاش میں ہاتھ مارتا اور آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ کالے موسموں کے اس سفر میں انسان کی بے بسی، مظلومیت اور بے چارگی کے مناظر اعجاز راہی کے احساس میں زہر گھولتے رہتے ہیں اور اس زہر کی سُرخی الفاظ بن کر اُس کے ہونٹوں سے ٹپکنے لگتی ہے ؎

آگ سی ہر طرف لگی کیوں ہے زندگی اس قدر بجھی کیوں ہے
تم تو کہتے تھے کٹ گئیں گھڑیاں چار سو پھر یہ بیکلی کیوں ہے

زخمی سوچیں چاروں اور پھیلا زرد ہوا کا شور
زندگی دہشت زدہ ہے اِن دنوں شہر میں پھیلا ہوا ہے اک ہراس

زرد پتوں کے شجر میں زردیاں ہیں شہر میں

درد سے لبریز اندھی بستیاں ہیں شہر میں

درد سے لبریز ان اندھی بستیوں کے باسی ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور ہو چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ دورِ رواں کا انسان جس شدت سے آپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہے۔ اس سے پہلے شاید کبھی اتنی شدت سے محسوس نہ کیا ہو گا۔

میں تنہا اور چُپ کمرہ ہر سو کالی رات کا زور

اِس مشینی دَور میں ہر انسان مشین کے پرزوں کی طرح اپنی اپنی جگہ اپنا اپنا کام کر رہا ہے لیکن مشین کا پرزہ ہونے کے باوجود اس کی حیثیت، قدر و قیمت اور مقصد دوسرے سے جُدا ہے۔ وہ مشین میں موجود ہونے کے باوجود الگ، اور تنہا اپنے وجود کی بقا کے لئے دُوسرے پُرزوں کے ہجوم میں مصروفِ عمل ہے۔ اس دوران اس کو اس حقیقت کا بھی بڑی شدت سے احساس اور خوف ہے کہ اگر اُس کے عمل اور دُوسرے پرزوں کے مقابلے میں وقت کے تقاضوں کو پُورا کرنے کی صلاحیت کم ہوئی تو وقت کا بے رحم ہاتھ اُس کے وجود کو ناکارہ اور بے کار جان کر پوری مشین سے نکال باہر پھینکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پُرزہ – ہر انسان – ایک دُوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے کو ایک دوسرے سے دور محسوس کرتا ہے۔

• تیرے میرے رستے ہوں جیسے کالے کوس۔
تو اور میں۔
اک دوجے سے دور

کالی گلیاں - لمبی سڑکیں
ٹوٹا زرد مکان
چاروں اور گھنیرے سائے
میں اور درد کا شہر

جذباتی رشتوں، رشتوں کے ٹوٹنے کے بعد آج انسان تنہائی کے گہرے، اندھیرے اور بے نشان غاروں میں پڑا ایک طرف تو ان اندھیروں اور تنہائیوں سے نکل کر ان جذباتی رشتوں کو جوڑنے کی سعئی لاحصل میں ہاتھ پاؤں مارتا دکھائی دیتا ہے اور دوسری طرف گزرے وقت کا زہر اس کے دل و دماغ میں آگ بن کر پھیل رہا ہے۔

چاروں جانب پاگل یادیں
پھیلائے آغوش
اندھی رات کی رگ رگ میں ہے۔
گزرے وقت کا زہر۔
جلتے جلتے ذہن میں رقصاں
تنہائی کا قہر

جذباتی رشتوں کے ٹوٹنے، اپنی بقا کی جنگ میں مختلف تجربات، محسوسات، کیفیات اور مشاہدات سے گزر کر آوازوں، اور انسانوں کے اس جنگل میں آج انسان —— انفرادی اور اجتماعی طور پر جو کچھ محسوس کر رہا ہے۔ اعجاز راہی کی شاعری میں جاری و ساری ہے۔

میں سمٹتا جا رہا ہوں دم بدم
دُور جنگل سے صدا آنے لگی
ذہن گہری اُلجھنوں کا ہے اسیر
اتنی دیواریں ہیں میری راہ میں
جن کے بارے میں کبھی سوچا نہ تھا
زندگی جس رُوپ میں ہے آجکل
زندگی کو آج تک دیکھا نہ تھا
زخم خوردہ دِل ہیں اور مجبوریاں
اس سے پہلے بھی تو ایسے روگ تھے
مجھ کو بھی جینا ابھی کچھ اور ہے
مجھ سے پہلے بھی جہاں میں لوگ تھے

اعجاز راہی کی یہ نظم — اگر میں یہ کہوں کہ عصر حاضر کے انسان کی بھرپور ترجمان ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا اور اعجاز راہی نے اپنے دور کے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مجبوری بے بسی، مایوسی، ناآسودگی، تنہائی اور مظلومی کا جس خلوص اور سچائی سے اپنی نظموں اور غزلوں میں اظہار کیا ہے وہ منفرد اور ممتاز ہے۔ بشرطیکہ ان نظموں اور غزلوں کے الفاظ کے سینے میں کالے موسموں کے مسافر کا جو دل دھڑک رہا ہے اُس کی دھڑکن اور خلوص کو محسوس کیا جائے۔ ان کی ظاہری ہیئت کو نہ دیکھا جائے، ورنہ اعجاز راہی کا شکوہ بجا ہوگا کہ ؎

دل کے اندر جھانکتا کوئی نہیں دیکھتے ہیں لوگ کیسا ہے لباس

دھڑکنیں

پاکستانی عوام کے دلوں کی دھڑکنیں ان کے ادب اور ثقافت کا حصہ ہیں۔ عوام کے دل جو ایک ہی آہنگ پر دھڑکتے ہیں۔ ایک ہی تال پر رقص کرتے ہیں اور ایک ہی جذبے سے سرشار ہیں۔ ان دھڑکنوں اور ان جذبوں کو افسانہ نگار کے قلم نے لفظوں کی صورتیں عطا کی ہیں اور ان میں پاکستانی دھرتی کی خوشبو رچی بسی ہے —— اپنی زمین کے ان بکھرے ہوئے جواہر پاروں اور سنگریزوں کو "دھڑکنیں" کے نام سے ایک مجموعے کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب

کی لازوال کہانیاں

مرتب

تاج سعید

مکتبۂ ارژنگ۔ (ظہیر آباد) پشاور

آدمی کا مقدر

ترجمہ

قرۃ العین حیدر

میخائل شولوخوف کا شمار اس صدی کے عظیم مصنفین میں کیا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ محاذ جنگ پر اخباری نمائندے کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس ناولٹ کا تانا بانا انہوں نے اسی جنگ کے تلخ اور کرب ناک تجربوں کی روشنی میں بُنا ہے اور "آدمی کے مقدر" کی تخلیق کی ہے۔

قیمت:

۲/- روپے

مکتبۂ ارژنگ، ظہیر آباد، پشاور

زیتون بانو صاحبہ کے پشتو افسانوں کے اردو تراجم کا مجموعہ ,,شیشم کا پتا،، ایک ملک گیر حیثیت کا مجموعہ ہے جس سے ہر زبان کے افسانہ نگاروں نے روشنی حاصل کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سرحد کی معاشرت کی جو عکاسی اور نمائندگی زیتون بانو صاحبہ نے کی ہے وہ فکشن کی دنیا میں قطعی طور پر منفرد ہے ان افسانوں کے تراجم رواں سلیس اور سچے ہیں۔ ترجمہ اگر معیاری نہ ہو تو اس زبان پر بھی زد پڑتی ہے جس میں اولاً یہ افسانے لکھے گئے ہیں مگر اس کتاب کے مترجمین نے خوبصورت اردو میں ترجمہ کر کے پشتو کی خوبصورتی کا بھی بالواسطہ اعتراف و اعلان کیا۔

احمد ندیم قاسمی

"شبِ رفتہ" کے بعد مجید امجد نے اظہار کے نئے قرینوں کو آزمایا، فکر کے نئے زاویوں کو تراشا اور ہیئت کے کئی نئے تجربے کیے۔ مجید امجد کے جاودان تجربات کا ایک لازوال انتخاب تاج سعید نے کیا ہے۔

مرے خدا مرے دل

مجید امجد

مجید امجد کی شاعری کا دوسرا نمائندہ مجموعہ

خوبصورت گٹ اپ

قیمت ۱۵/- روپے

تصویریں

کامیاب ناول نگار رحیم گل کے سحر طراز قلم سے
مشہور شعرا اور ادبا کے خوبصورت خاکے زیر
اشاعت ہیں ۔